مولانا مودودی مرحوم اور میں

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مولانا مودودی مرحوم اور میں

ڈاکٹر اسرار احمد

شائع کردہ:

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔فون:03-5869501

نام کتاب ـــــــــــ مولانا مودودی مرحوم اور میں

طبع اوّل (اگست 1994ء) ـــــــــــ 2000

طبع دوم (جنوری 2004ء) ـــــــــــ 1100

طبع سوم (نومبر 2006ء) ـــــــــــ 1100

ناشر ـــــــــــ ناظم نشرواشاعت، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت ـــــــــــ 36۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور

فون: 5869501-3

مطبع ـــــــــــ شرکت پرنٹنگ پریس، لاہور

قیمت ـــــــــــ 30 روپے

email:publications@tanzeem.org
website:www.tanzeem.org

ترتیب

عرض ناشر

صہ ۴

○

باب اول

میرے پہلے سفر امریکہ کے بعض حالات و واقعات' اور

مولانا مودودی مرحوم سے ملاقات کی شدید خواہش' اور

ان کی نمازِ جنازہ میں شمولیت کی سعادت

صہ ۵

○

باب دوم

مولانا مودودیؒ کے ساتھ

میرے تعلق کا ابتدائی دور

صہ ۲۱

○

باب سوم

"یادِ یارِ مہرباں آید ہمے"

صہ ۴۳

○

عرضِ ناشر

"مولانا مودودی مرحوم اور میں" کے عنوان سے امیر تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے ایک مفصل مضمون کی تسوید کا آغاز مولانا کی وفات کے تین سال بعد اگست ۸۲ء میں کیا تھا۔ ستمبر اور اکتوبر ۸۲ء کے میثاق کے شماروں میں اس سلسلے کی دو خاصی طویل اقساط شائع ہوئیں اور اس کے بعد یہ سلسلہ جاری نہ رہ سکا۔ پھر ٹھیک دس برس بعد، ستمبر ۹۲ء میں محترم ڈاکٹر صاحب نے اس سلسلۂ مضمون کو آگے بڑھایا اور دو نسبتاً مختصر اقساط میں اس مضمون کو سمیٹتے ہوئے بحث کو مکمل کر دیا۔

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے یہ مضمون مولانا مودودی مرحوم کے بارے میں محترم ڈاکٹر صاحب کے ذاتی احساسات و تاثرات پر مشتمل ہے۔ جماعت اسلامی کے وابستگان میں سے اکثر محترم ڈاکٹر صاحب کو مولانا مودودی مرحوم اور ان کی جماعت یعنی جماعت اسلامی کے شدید ناقدوں میں شمار کرتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ایک دور میں محترم ڈاکٹر صاحب نے مولانا مودودی مرحوم کے بعض اِقدامات اور جماعت اسلامی کی بعض پالیسوں پر شدید نکتہ چینی کی۔ اُس دور کے تحریر کردہ سیاسی تجزیوں میں تلخی کا رنگ غالب ہے لیکن یہ ایک وقتی معاملہ تھا جو زیادہ دیر برقرار نہیں رہا۔ چنانچہ جیسا کہ امیر تنظیم اسلامی نے اپنی کتاب "اسلام اور پاکستان" کے دیباچے میں تحریر کیا ہے، مولانا مرحوم کے ساتھ ان کے ذہنی و قلبی تعلق میں شدید نوعیت کے اتار چڑھاؤ کا معاملہ رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس حقیقت کا اظہار بایں الفاظ کیا ہے :

> "...... مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی مرحوم و مغفور کا معاملہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے، اس لئے کہ ان کے ساتھ میرے ذہنی و قلبی تعلق میں اتار چڑھاؤ کی کیفیت شدت کے ساتھ واقع ہوئی ہے۔ چنانچہ اس کا آغاز شدید ذہنی و فکری مرعوبیت اور گہری قلبی محبت و عقیدت کے ساتھ ہوا، جس میں ذاتی احسان مندی کا عنصر بھی شدت کے ساتھ موجود تھا۔ لیکن پھر اختلاف پیدا ہوا تو وہ بھی انتہائی شدید تھا اور اس کے نتیجے میں مایوسی ہی نہیں شدید بیزاری کی کیفیت قلب و ذہن پر طاری رہی، لیکن آخر کار اس پر افسوس، ہمدردی اور حسرت کا رنگ غالب آگیا اور قلب کی گہرائیوں میں کم از کم احسان مندی کے احساسات بتمام و کمال عود کر آئے۔"

زیرِ نظر کتابچے میں جو مضامین شامل ہیں وہ چونکہ مولانا مودودی مرحوم کی وفات کے تین سال بعد بلکہ ان میں سے بعض تیرہ سال بعد تحریر کئے گئے ہیں لہٰذا بلا خوفِ تردید پر کہا جا سکتا ہے کہ مولانا مرحوم کے بارے میں محترم ڈاکٹر صاحب کے جذبات و احساسات کی حقیقی عکاسی انہی مضامین کے ذریعے ہوتی ہے!

باب اول

میرے پہلے سفرِ امریکہ کے بعض حالات و واقعات اور

مولانا مودودی مرحوم سے ملاقات کی شدید خواہش اور ان کی نمازِ جنازہ میں شمولیت کی سعادت

(شائع شدہ 'میثاق' ستمبر ۸۲ء بعنوان 'مولانا مودودی مرحوم اور میں')

یہ آج سے ٹھیک تین سال قبل کا ذکر ہے۔

اگست ۱۹۷۹ء کا وسط تھا اور رمضان المبارک ۱۳۹۹ھ کا آخری عشرہ شروع ہونے والا تھا جب میرے پہلے سفرِ امریکہ کی تیاری مکمل ہوئی۔ اور امیدِ واثق ہوئی کہ اگر کوئی نادیدہ رکاوٹ پیش نہ آ گئی تو میں ہفتہ عشرہ میں بالٹی مور پہنچ جاؤں گا۔ اندریں حالات ایک روز اچانک ایک خیال ذہن میں بجلی کی طرح کوندا ـــ آج کل مولانا مودودی بھی امریکہ ہی میں مقیم ہیں۔ کاش کہ وہاں ان سے ملاقات کی صورت نکل آئے! اُس وقت تک امریکہ کے جغرافیہ کے بارے میں میری معلومات بس موٹی موٹی باتوں تک ہی محدود تھیں اور اس کی ریاستوں اور شہروں کے محلِ وقوع کے بارے میں تفصیلی معلومات نہ ہونے کے برابر تھیں' لہٰذا کچھ اندازہ نہ تھا کہ میرا امریکہ کے جن جن شہروں میں جانے کا پروگرام تھا' بفلو جہاں مولانا کا قیام تھا ان میں سے کسی کے آس پاس واقع ہے یا نہیں اور وہاں بآسانی جانا ممکن ہو گا یا نہیں' تاہم ایک خواہش تھی جو مسلسل زور پکڑتی چلی گئی یہاں تک کہ اس نے "ارادے" کی صورت اختیار کر لی کہ حتی الامکان اس سفر کے دوران مولانا سے ملاقات کی کوشش کروں گا ـــــ اس پر

فطری طور پر بہت سی بھولی بسری باتیں بھی ذہن میں تازہ ہوئیں اور بہت سے سوئے ہوئے جذبات و احساسات بھی از سرِ نو بیدار ہوئے اور فی الجملہ قلب و ذہن پر اس کیفیت کا تسلط سا ہو گیا جو اس شعر میں بیان ہوئی ہے کہ۔

"ترکِ تعلّقات بھی عینِ تعلّقات ہے
آگ بجھی ہوئی نہ جان آگ دبی ہوئی سمجھ!"

ان کیفیات میں جب کبھی یہ خیال آتا تھا کہ مولانا سے یہ ملاقات پورے سوا سترہ سال بعد ہو گی تو ایک عجیب سی حسرت آمیز مسرت کا احساس ہوتا تھا جس کی تعبیر الفاظ کے ذریعے ممکن نہیں۔

یہاں فطری طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر ایک ہی ملک میں رہتے ہوئے پورے سترہ سال ملاقات کیوں نہ کی ـــــ بلکہ پورے بارہ سال سے ایک ہی شہر میں زیادہ سے زیادہ تین چار میل کے فاصلے پر مقیم ہوتے ہوئے بھی ملاقات کا خیال کیوں نہ آیا ـــــ اور اب اچانک کرۂ ارضی کے بالکل دوسری جانب دیارِ غیر میں ملاقات کا اشتیاق اس قدر شدت سے کیوں پیدا ہوا؟ ـــــ تو اصل میں اسی سوال کا جواب ہے جو اس تحریر کے ذریعے دیا جانا مقصود ہے۔ اگرچہ اس کے لئے قارئین کو ذرا صبر سے کام لینا ہو گا۔

لاہور سے ہفتہ ۱۸/ اگست ۷۹ء کی شام اور کراچی سے ۲۱/ اگست کو علی الصبح ڈیڑھ بجے روانہ ہو کر میں اسی تاریخ کی رات کو ساڑھے نو بجے امریکہ میں اپنے پہلے "مقام" بالٹی مور جا پہنچا۔ اس سفر کے بعض نہایت دلچسپ واقعات میں ایک "رودادِ سفر" کی صورت میں تحریر کر چکا ہوں جو "میثاق" کے جنوری، فروری ۸۰ء کے شمارے میں شائع ہوئی تھی۔ بہر حال بالٹی مور میں میں نے اپنے میزبانوں سے اولین معلومات

جو حاصل کیں وہ .بفلو ہی کے بارے میں تھیں اور میرے دل کی کلی ایک دم کِھل اٹھی اور امیدوں کے چراغ دفعتہً روشن ہو گئے جب مجھے معلوم ہوا کہ .بفلو ٹورنٹو سے' جہاں مجھے اپنے اس سفر کے دوران سب سے طویل قیام کرنا تھا' صرف سو میل کے فاصلے پر واقع ہے اور وہاں سے .بفلو آنا جانا باآسانی ایک دن میں ہو سکتا ہے۔

یکم ستمبر۷۹ء تک بالٹی مور واشنگٹن ایریا میں قیام کے بعد' دو دن ڈلاس میں اسلامک میڈیکل ایسوسی ایشن آف نارتھ امریکہ کے سالانہ کنونشن کی نذر کر کے ۴/ ستمبر کو ٹورنٹو پہنچا تو وہاں بھی اولین معلومات مولانا ہی کے بارے میں حاصل کیں تو معلوم ہوا کہ ان کی طبیعت ناساز ہے۔ تاہم مقامی "حلقۂ احبابِ اسلامی[۱]" کے رفقاء کا مولانا کے صاحبزادے ڈاکٹر احمد فاروق سے مسلسل رابطہ قائم ہے اور ان شاء اللہ جلد ہی ملاقات کی صورت پیدا کر لی جائے گی —— ایک دو روز بعد معلوم ہوا کہ مولانا کی انتڑیوں کی تکلیف بڑھ گئی تھی جس کے باعث ایک بڑا آپریشن کرنا پڑا اور اب ان سے ملاقات لگ بھگ دو ہفتے کے بعد ہی ممکن ہو گی۔اس سے فوری طور پر تو امید کے چراغ کچھ بجھتے سے محسوس ہوئے لیکن ساتھ ہی اللہ کا شکر بھی قلب کی گہرائیوں سے ابھرا کہ ٹورنٹو میں میرے قیام کا پروگرام پہلے ہی سے دو ہفتے سے زائد طے تھا—— البتہ ایک دوسری چیز جس کا ذکر بار بار سننے میں آ رہا تھا کسی قدر تشویش کی موجب بن رہی تھی اور وہ یہ کہ حلقۂ احباب کے اکثر ارکان کا کہنا تھا کہ ڈاکٹر احمد فاروق بہت سخت مزاج بلکہ بد تمیز قسم کے آدمی ہیں۔انہیں یہ تو بالکل ہی پسند نہیں ہے کہ کوئی ان کے والد سے ملاقات کے لئے آئے' فون پر بھی ان کا انداز بہت روکھا پھیکا بلکہ درشت اور خشونت آمیز ہوتا ہے —— خود مجھے مولانا کے صاحبزادگان اور ان کے مزاج سے قطعاً کوئی واقفیت نہ تھی۔ جماعت اسلامی کے مرکز واقع ۵/ اے ذیلدار پارک اچھرہ میں

---

[۱] جماعت اسلامی کے وابستگان اور متاثرین نے نہ معلوم کن مصلحتوں کو بنا پر امریکہ میں اپنے آپ کو جماعت کے نام سے منظم کرنے کی بجائے "حلقہ احباب اسلامی" کے نام سے صرف ایک ڈھیلے ڈھالے حلقہ احباب کی صورت دے رکھی ہے!

جہاں مولانا بھی اپنے اہل و عیال سمیت مقیم تھے میری آمد و رفت زیادہ تر ۵۱ء سے ۵۴ء تک رہی تھی اور اُس وقت تک مولانا کے تمام صاحبزادے بہت چھوٹے تھے' چنانچہ میں ان میں سے نام بھی صرف سب سے بڑے کا جانتا تھا یعنی سید عمر فاروق مودودی کا۔ ڈاکٹر احمد فاروق مودودی کا نام پہلی بار اس وقت سننے اور پڑھنے میں آیا تھا جب مولانا چند سال قبل بغرضِ علاج لندن اور امریکہ گئے تھے۔ باقی ان سے کوئی اور واقفیت قطعاً نہ تھی — بہرحال اس قسم کی باتوں سے دل ڈوبتا سا محسوس ہوا کہ اگر "حلقۂ احبابِ اسلامی" کے ارکان کے ساتھ مولانا کے صاحبزادے کا رویّہ یہ ہے تو "تا بہ من چہ می رسد؟" — تاہم ارادہ بہرحال یہی رہا کہ "ہرچہ بادا باد!" ملاقات کی کوشش ضرور کرونگا۔

اسی اثناء میں ایک روز میں ٹورنٹو کی بوسٹیڈ روڈ کی جامع مسجد میں بعد نماز مغرب قرآن مجید کا درس دے رہا تھا کہ ایک صاحب نے ایک رقعہ تھمایا جس میں تحریر تھا کہ مولانا مودودی پر عارضۂ قلب کا حملہ ہوا ہے' ان کے لئے دعائے صحت کرا دیجئے! اس خبر سے خود میرے اعصاب پر شدید صدمے کا حملہ ہوا اور میں چند لحظے تو گم سم اور بھونچکا سا رہا۔ بعد میں اپنے حواس کو مجتمع کر کے میں نے حاضرین کو اس کی اطلاع بھی دی اور اجتماعی دعا بھی کی — تاہم پہلی بار مجھے کچھ ایسے محسوس ہوا کہ جیسے منزل عین نگاہوں کے سامنے آنے کے بعد نظروں سے اوجھل ہوتی جا رہی ہو اور میرے ساتھ "تدبیر کند بندہ' تقدیر کند خندہ" والا معاملہ ہو رہا ہو۔

قیامِ ٹورنٹو کے دن پورے ہو گئے لیکن بفلو سے ملاقات کی اجازت موصول نہ ہوئی تو دل ڈوبنے سا لگا لیکن دفعۃً پھر امید کی ایک کرن نمودار ہوئی اس لئے کہ ٹورنٹو میں میرے میزبان سمیع اللہ خان صاحب نے مانٹریال کے بعض احباب کے اصرار کی بنا پر وہاں کے سفر کا پروگرام بنا لیا۔ یہ سفر کار کے ذریعے ہوا اور اس میں تین دن صَرف ہو گئے — واپس آئے تو تازہ ترین اطلاع یہ ملی کہ اب مولانا کی طبیعت بہت حد تک بحال ہو چکی ہے اور ان شاء اللہ زیادہ سے زیادہ دو تین روز کے بعد ملاقات کی اجازت

مل جائے گی ـــــ ادھر بعض احباب کی تحریک پر میری ایک وِزٹ (VISIT) شکاگو کی طے ہو گئی تھی اور ریزرویشن اس طرح ہوئی تھی کہ ٹورنٹو سے شکاگو جانا ہو گا اور وہاں سے براہ راست نیویارک جہاں سے واپسی کا سفر شروع ہو جانا تھا۔ میری خواہش پر احباب نے پورا پروگرام تبدیل کیا اور اب طے پایا کہ میں شکاگو میں دو تین دن قیام کر کے واپس ٹورنٹو آؤں اور یہاں سے بفلو جا کر احباب کی معیت میں مولانا سے ملاقات کروں اور پھر ٹورنٹو سے نیویارک روانہ ہوں ـــــ ٹورنٹو کے احباب کے میری خوشنودی کی خاطر اتنے اہتمام پر (جس پر یقیناً پیسے کا صَرف بھی بڑھ رہا تھا) ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے جمعہ ۲۱/ ستمبر کی سہ پہر کو میں شکاگو روانہ ہوا۔ شکاگو کا ذکر تو اس سے قبل بہت سننے پڑھنے میں آیا تھا' اور اکثر و بیشتر کسی اچھی بات کے ضمن میں نہیں بلکہ کسی نہ کسی برائی ہی کے سلسلہ میں آیا تھا' تاہم وہاں کسی سے کوئی ذاتی شناسائی نہ تھی۔ ٹورنٹو میں جو احباب میرے درس میں تسلسل اور پابندی کے ساتھ شریک رہے تھے ان میں سے ایک صاحب نے خود ہی خفیہ خفیہ اپنے ایک عزیز ڈاکٹر خورشید احمد ملک صاحب کو میری آمد کی اطلاع دے کر ان سے "دعوت" منگوالی تھی اور اب میں صرف ان کے نام کی واقفیت کے ساتھ شکاگو جا رہا تھا ـــــ شکاگو کی "اوہیئر" ایئرپورٹ پر جو صاحب لینے آئے وہ ڈاکٹر خورشید ملک نہیں بلکہ ڈاکٹر وصی اللہ خان تھے۔ معلوم ہوا کہ ڈاکٹر خورشید چونکہ خود کسی آپریشن کے سلسلے میں مصروف تھے لٰہذا انہوں نے انہیں میرے استقبال پر مامور کیا ہے۔ جلد ہی یہ بات کھل گئی کہ یہ وہی ڈاکٹر وصی اللہ ہیں جن کا ذکر لاہور میں پنجاب یونیورسٹی کے انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشن اینڈ ریسرچ کے ضمن میں جماعت و جمعیت کے حلقوں میں سننے میں آتا رہا تھا ـــــ بلکہ مزید انکشاف یہ بھی ہوا کہ ہم آپس میں دور نزدیک کی قرابت بھی رکھتے ہیں ـــــ یعنی ان کی والدہ صاحبہ اور میری والدہ ماجدہ دونوں ایک ہی خاندان سے ہیں ـــــ بہرحال ڈاکٹر وصی اللہ خان نے مجھے تیس چالیس میل کا سفر اپنی کار پر طے کرا کے ڈاکٹر خورشید صاحب کے مکان واقع ڈاؤنرز گرو پر پہنچایا۔ اور مجھے وہاں ڈراپ کر کے وہ خود بھی فوراً اپنی کسی

مصروفیت کا عذر کر کے روانہ ہو گئے ــــ اب میں تھا اور ایک خالص اجنبی ماحول' لیکن جلد ہی یہ سارے حجابات دور ہو گئے۔ ڈاکٹر خورشید صاحب کی والدہ صاحبہ نے جس شفقت و محبت کا اظہار کیا اور ان کے وجود کے روئیں روئیں سے جس سادگی اور اخلاص کی مہک آئی اس نے فوراً ہی ایسے محسوس کرادیا کہ گویا میں اپنے ہی گھر میں اپنی ہی حقیقی والدہ کے زیر سایہ ہوں۔ تھوڑی دیر میں ڈاکٹر خورشید صاحب بھی آ گئے تو اندازہ ہوا کہ "اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیہِ" کے حق ہونے میں تو غالباً سب ہی کو اتفاق ہے لیکن یہاں اصل معاملہ "اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِوَالِدَتِہٖ" کا ہے' ــ نہایت کھلے مزاج کے حامل اور خلوص و اخلاص کے پیکرِ کامل! ــــ مجھے اس وقت کچھ اندازہ نہ تھا کہ آئندہ میرے سالانہ سفر امریکہ کا اصل باعث اسی شخص کو بننا ہے اور امریکہ سے کُل کا کُل تعلق ان ہی کے واسطے سے ہو گا۔

بہر حال بعد نماز مغرب ان کے مکان پر درس قرآن کی نشست ہوئی جس کے کُل شرکاء نہایت اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے ــــ اور اکثر طب کے پیشے سے متعلق تھے۔ اگلے روز یعنی ہفتہ ۲۲/ ستمبر کی صبح کو ڈاکٹر صاحب تو پھر اپنی معالجاتی ذمہ داریوں کی انجام دہی کے لئے گھر سے نکل گئے۔ مجھے ایسے ہی خیال آیا کہ صدر ایوب خان مرحوم کے دور کی ایک "بدنام" علمی شخصیت ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کے بارے میں سنا تھا کہ شکاگو میں مقیم ہیں۔ ڈاکٹر خورشید صاحب کے اہل خانہ سے ان کا ذکر کیا تو معلوم ہوا کہ قیام تو ان کا زیادہ دور نہیں ہے (یعنی یہی کوئی چھ سات میل کے فاصلے پر ہے!) لیکن وہ کسی سے کم ہی ملتے جلتے ہیں لہٰذا ملاقات آسان نہیں ہے ــــ میں نے توکلاً علی اللہ ان کو فون کر دیا تو حیرت ہوئی کہ وہ فوراً ہی خود آنے کے لئے تیار ہو گئے اور آدھ گھنٹے کے اندر اندر کرتے پاجامے ہی میں تشریف لائے۔ میں ان کے بعض نظریات سے شدید اختلاف رکھنے کے باوجود ان کی سادگی اور علمی خلوص کا پہلے سے معترف تھا اور ۶۸ء میں جو ہنگامہ ان کے خلاف پاکستان کے مذہبی حلقوں کی جانب سے ہوا تھا اس میں میں نے ان کی جانب سے کچھ تھوڑی سی "مدافعت" بھی کی تھی (جس پر مولانا حکیم

عبدالرحیم اشرف صاحب نے مجھے اپنے مجلّے "المنبر" میں "ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے نئے وکیل: ڈاکٹر اسرار احمد" کے خطاب سے نوازا تھا!) غالباً اسی کا اثر تھا کہ کامل گوشہ گیری اور ملنے جلنے سے احتراز کے باوجود ڈاکٹر صاحب مجھ سے ملنے کے لئے اس طرح بلا تامل و تکلف چلے آئے۔

بہرحال ابھی ان سے گفتگو کا آغاز ہوا ہی تھا کہ ڈاکٹر خورشید صاحب گھبرائے ہوئے آئے اور انہوں نے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ مولانا مودودی کا انتقال ہو گیا ہے' مجھے معاً یہ خیال آیا کہ ٹورنٹو میں مولانا کی طبیعت کی بحالی کی جو خبر ملی تھی وہ دراصل ان کا آخری "سنبھالا" تھا جیسے بجھنے والا چراغ آخری بار ذرا دیر کے لئے بھڑک اٹھتا ہے —— میرے اعصاب پر اس خبر سے بجلی سی گری اور میں گم سم سا ہو گیا۔ ڈاکٹر خورشید نے میرے احساسات اور جذبات کا اندازہ کرتے ہوئے فوراً سوال کر دیا "کیا آپ مولانا کے جنازے میں شرکت کرنا چاہیں گے؟" جس پر میری زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکل گئے "کیا یہ ممکن ہے؟" —— اس کا کوئی جواب تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے نہ دیا البتہ فوراً ٹیلی فون کی جانب متوجہ ہو گئے اور چند ہی منٹوں میں مژدہ سنایا : "فوراً تیار ہو جائیں! حلقہ احبابِ اسلامی کا ایک قافلہ فی الفور بفلو کے لئے روانہ ہو رہا ہے اور آپ کے لئے بھی ان کے ساتھ ہی بکنگ ہو گئی ہے۔" چنانچہ نہایت عجلت میں ایئر پورٹ کے لئے روانگی ہوئی اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب بھی اسی کرتے پاجامے میں میرے ساتھ ایئر پورٹ تک گئے (حالانکہ امریکی تہذیب کے اعتبار سے یہ بہت گری ہوئی حرکت ہے۔ وہاں صرف ایک نیکر اور بنیان پہن کر تو انسان پورا "ملبس" شمار ہوتا ہے' لیکن کرتے پاجامے والا انسان "ننگا" قرار پاتا ہے!) راستے میں وہ مولانا کے ساتھ اپنی جوانی کے دور کے ذاتی مراسم کا ذکر کرتے رہے اور نظریات میں شدید اختلافات کے باجود مولانا کا ذکر اچھے الفاظ میں کرتے رہے۔ ایئرپورٹ پر آٹھ دس حضرات کا قافلہ موجود تھا جن میں سے کسی سے کوئی ذاتی تعارف نہ تھا' صرف بعض حضرات رات کے درس میں شریک رہے تھے —— البتہ اچانک برادرم ظفرالحق

انصاری نظر آئے تو محسوس ہوا کہ یہ شعر عام حالات میں تو شاید مبالغے ہی پر مبنی نظر آئے گا لیکن "دیارِ غیر" کی حد تک بالکل مبنی بر حقیقت ہے کہ ۔ "اے دوست! کسی ہمدمِ دیرینہ کا ملنا۔ بہتر ہے ملاقاتِ مسیحاؑ و خضرؑ سے"۔ — بہرحال بفلو ائیرپورٹ سے باہر آئے تو معلوم ہوا کہ راستہ وغیرہ کسی کو معلوم نہیں۔ فون پر ڈاکٹر احمد فاروق سے رابطہ قائم کیا تو معلوم ہوا کہ ہمیں پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔ نماز جنازہ ہو چکی ہے اور "فیونرل ہوم" (Funeral Home) والے مولانا کی میت کو لینے کے لئے بس آنے ہی والے ہیں۔ اس اطلاع سے سب پر سراسیمگی سی طاری ہو گئی۔ کیا بفلو پہنچنے کے باوجود نہ مولانا کی نماز جنازہ ادا کرنے کی سعادت حاصل ہو گی' نہ ان کا منہ دیکھنا ہی نصیب ہو گا؟ — لیکن ڈاکٹر احمد فاروق صاحب کے گھر پہنچنے پر معلوم ہوا کہ الحمدللہ ابھی مولانا کی میت وہیں موجود ہے — حالانکہ ہمیں گھر کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکنے میں خاصی تاخیر بھی ہو گئی تھی۔

میرے دل کی اس وقت جو کیفیت تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ ایک جانب شدید رنج و صدمہ اور خاص طور پر یہ حسرت کہ مولانا سے ان کی زندگی میں ملاقات نہ ہو سکی اور جو خواہش اس قدر اچانک اور اتنی شدت سے پیدا ہوئی تھی وہ تشنۂ تکمیل رہ گئی اور وہ بھی اس شان سے کہ ۔

"قسمت کی خوبی دیکھئے ٹوٹی کہاں کمند
دو چار ہاتھ جب کہ لبِ بام رہ گیا!"

دوسری جانب خود مولانا کے بارے میں یہ حسرت آمیز احساس کہ "مارا دیارِ غیر میں مجھ کو وطن سے دور!" — یہاں امریکہ میں کتنے لوگوں کو احساس ہو گا کہ آج کون دنیا سے اٹھ گیا۔ یہ حادثہ اگر لاہور میں پیش آیا ہوتا تو جو کہرام پورے شہر میں مچا ہوتا اسے چشمِ تصور کے سامنے رکھتے ہوئے جب میں نے ڈاکٹر احمد فاروق کے مکان پر جمع گنتی کے چند اشخاص کو دیکھا تو دل میں درد کی ایک شدید ٹیس محسوس ہوئی' تیسری جانب خود اپنے بارے میں ایک انجانا سا خوف تھا کہ نامعلوم یہاں میرا استقبال کس طرح ہو۔

ذہناً میں اس کے لئے بھی پوری طرح تیار ہو کر گیا تھا کہ ڈاکٹر احمد فاروق نہایت درشتی کے ساتھ کہہ دیں کہ "آپ اب یہاں کیا لینے آئے ہیں؟ گھر میں داخل ہونے کی کوشش نہ کریں!" اور یوں میں باہر ہی سے بصد حسرت دیاس لوٹا دیا جاؤں!

لیکن میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب ڈاکٹر احمد فاروق نے میرا استقبال نہایت شریفانہ و مہذبانہ انداز ہی میں نہیں حددرجہ ادب و احترام کے ساتھ کیا اور چھوٹتے ہی یہ الفاظ کہے :

> "میں نے آپ کا سلام ابا جان کو پہنچا دیا تھا ـــــ اور یہ بھی کہ آپ ملاقات کے خواہشمند ہیں۔ ادھر ابا جان بھی آپ سے ملاقات کے بہت خواہاں تھے لیکن ڈاکٹروں نے شدید پابندی لگائی ہوئی تھی کہ نہایت قریبی اعزّہ کے سوا اور کوئی ملاقات نہ کرے!"

میرے حواس نیم گم سم تو پہلے ہی سے تھے' ڈاکٹر احمد فاروق کی زبان سے یہ الفاظ سن کر میں بالکل ہی گم سم ہو کر رہ گیا۔ جس پر خود انہوں نے مجھے مکان کے اندر آنے کی دعوت دی۔ ان کے ڈرائنگ روم میں ایک بنچ پر مولانا کا جسدِ خاکی سفید براق کفن میں لپٹا رکھا تھا۔ بصد حسرت دیاس ان کا دیدار کیا اور پھر نماز جنازہ کے لئے صف درست کی' سب لوگوں نے باصرار مجھے ہی امامت کے لئے آگے بڑھایا۔ جو لوگ اس سے قبل نماز ادا کر چکے تھے وہ بھی دوبارہ شریک ہو گئے لیکن اس پر بھی کل تعداد پندرہ بیس کی ہو گی۔ (اُس وقت جو کچھ معلوم ہوا وہ یہ تھا کہ اس سے قبل صرف ایک بار نماز جنازہ ہوئی ہے۔ بعد میں روزنامہ جسارت' کراچی میں شائع شدہ رپورٹ سے معلوم ہوا کہ اس سے قبل دو بار نماز جنازہ ادا کی جا چکی تھی اور میری امامت میں جو نماز ہوئی وہ تیسری تھی۔ واللہ اعلم!) ـــــ نماز سے فارغ ہوئے ہی تھے کہ شور مچ گیا کہ فیونرل ہوم والے آ گئے ہیں اور جلدی کر رہے ہیں۔ واضح رہے کہ امریکی قانون کے مطابق میت گھر پر لانے کی اجازت ہی نہیں ہوتی' ہسپتال سے لاش سیدھی فیونرل ہوم یعنی

"جنازہ گاہ" جاتی ہے اور وہیں غسل اور تجہیز و تکفین ہوتی ہے اور جملہ رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ یہ تو چونکہ احمد فاروق خود ڈاکٹر تھے ـــ اور ایک عرصے سے بفلو میں مقیم ہونے کے باعث کافی بااثر بھی تھے لہٰذا مولانا کی میت گھر پر آسکی اور تجہیز و تکفین کے مراحل مولانا کی اہلیہ صاحبہ کی نگرانی میں پورے سکون اور اطمینان کے ساتھ طے پا سکے ـــ یہ بات پہلے ہی عرض کی جا چکی ہے کہ "فیونرل ہوم" والوں کو کسی سبب سے دیر ہو گئی تھی تب ہی ہم مولانا کی زیارت بھی کر سکے اور نماز جنازہ بھی ادا کر سکے وگرنہ اگر وہ اپنے متعین وقت پر آ جاتے تو ہم ان سعادتوں سے بھی محروم ہی رہتے ـــ (جیسے کہ ڈاکٹر انیس احمد برادر خورد پروفیسر خورشید احمد محروم رہے' اس لئے کہ وہ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ اس وقت پہنچے جب مولانا کی میت روانہ ہو چکی تھی) ـــ بہرحال ڈرائنگ روم سے باہر فیونرل ہوم کی گاڑی تک لانے میں جو مختصر فاصلہ طے ہوا اس میں مولانا کی میت کو کندھا دینے کی سعادت بھی حاصل ہو گئی ـــ

اس موقع پر دو باتیں بہت اچھی مشاہدے میں آئیں: ایک یہ کہ ڈاکٹر احمد فاروق لوگوں کو مولانا کی تصویر اتارنے سے شدت سے روک رہے تھے بلکہ ایک موقع پر ذرا سی دیر کو وہ اندر گئے تو ایک نوجوان نے جلدی سے اپنے کیمرے کا بٹن دبا دیا اور تصویر اتار لی۔ لیکن ڈاکٹر احمد فاروق واپس آئے تو انہیں کسی طرح اس کا اندازہ ہو گیا۔ چنانچہ انہوں نے باصرار ان صاحب کے کیمرے سے فلم نکلوا لی اور یہ الفاظ کہے کہ "میں جانتا ہوں کہ آپ لوگ ان تصویروں کا کیا کریں گے!" اس سے مجھے کسی قدر اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر احمد فاروق کی مبینہ سخت مزاجی بلکہ "بدتمیزی" کی اصل حقیقت کیا ہے! ـــ دوسرے اس بحث کے ضمن میں کہ مولانا کی تدفین کہاں ہو مولانا کی اہلیہ صاحبہ کی یہ رائے سامنے آئی کہ ہماری تو خواہش ہے کہ مولانا کی تدفین مدینہ منورہ میں جنّت البقیع میں ہو ـــ لیکن اس ضمن میں آخری فیصلہ میاں طفیل محمد صاحب امیر جماعت اسلامی کا ہوگا اور اگر وہ ہماری رائے سے اتفاق کریں تو سعودی عرب کی حکومت سے اس ضمن میں گفت و شنید بھی وہ خود ہی کریں!"

اسی رات کی آخری فلائٹ سے جب ہم لوگ بھاری سے دل اور خالی سے ہاتھ لئے بفلو سے واپس شکاگو جارہے تھے تو جو کیفیات ہم سب پر طاری تھیں ان کا اندازہ ہر شخص بخوبی لگا سکتا ہے۔ ان کیفیات کے ساتھ ساتھ میرے ذہن میں ایک تو یہ سوال بار بار آرہا تھا کہ مولانا کی تدفین کہاں ہوگی؟ —— یہ تو مجھے یقین تھا کہ جماعت اسلامی پاکستان مولانا کی میت کو لازماً پاکستان ہی لے کر جائے گی۔ پاکستان میں میرا گمان تھا کہ اولاً تو کراچی کے احباب شدت کے ساتھ چاہیں گے کہ مولانا کی تدفین وہیں ہو۔ پورے پاکستان میں جماعت اسلامی کی مضبوط ترین تنظیم بھی کراچی ہی میں ہے اور اس کا سب سے زیادہ گہرا سیاسی اثر و رسوخ بھی وہیں ہے۔ کتنی ہی بار کراچی والوں نے چاہا تھا کہ جماعت کا مرکز کراچی منتقل ہو جائے لیکن بوجوہ ایسا نہ ہو سکا۔ میرا گمان تھا کہ اب آخری بار جماعت کراچی کی جانب سے ضرور کوشش ہوگی کہ مولانا کی آخری آرام گاہ تو وہاں بن ہی جائے —— لیکن ساتھ ہی یہ یقین بھی تھا کہ ایسا ہو نہیں سکے گا اور میت لامحالہ لاہور جائے گی —— اور وہاں کے حالات کے بارے میں اِدھر اُدھر سے جو معلومات وقتاً فوقتاً حاصل ہوتی رہی تھیں ان کی بنا پر اندیشہ تھا کہ مولانا کے پس ماندگان اور جماعت اسلامی کی قیادت کے مابین لازماً رسہ کشی ہوگی۔ جماعت کے ذمہ دار حضرات چاہیں گے کہ مولانا کی تدفین "منصورہ" میں ہو اور یہ مولانا کے صاحبزادوں کو کسی طور گوارا نہ ہوگا —— بالآخر ہوگا کیا؟ اس کا جواب تو میرے پاس نہ تھا البتہ دل میں یہ خواہش ضرور تھی کہ یا تو مولانا کی تدفین مولانا احمد علی رحمتہ اللہ علیہ کی طرح مسلمانوں کے عام قبرستان میں ہو —— یا اگر کوئی نمایاں جگہ مطلوب ہی ہو تو کاش کہ مولانا کو بادشاہی مسجد کے سامنے علامہ اقبال مرحوم کے پہلو میں جگہ مل جائے۔ اس میں جہاں ان دونوں زعماء کی فکری اور نظریاتی ہم آہنگی پیش نظر تھی وہاں یہ واقعہ بھی مدِ نظر تھا کہ مولانا کو حیدر آباد دکن سے جانب پنجاب ہجرت کی دعوت دینے والے علامہ اقبال مرحوم ہی تھے!! —— میرے ذہن کی یہ ساری ادھیڑ بن اپنی جگہ پر، لیکن چند روز بعد نیویارک میں مولانا محمد ناظم ندوی مدظلہ سے اور پھر لاہور واپسی پر اخبارات

وغیرہ کے ذریعے جو حالات معلوم ہوئے ان کا واقعہ یہ ہے کہ کوئی سان گمان بھی مجھے اُس وقت نہ تھا۔ نیویارک اور لندن کے ہوائی اڈوں پر ڈاکٹر احمد فاروق اور پروفیسر خورشید صاحب کے مابین تلخ کلامی' جماعت کی جانب سے کراچی کے کسی الیکشن کے پیش نظرمیت کے پاکستان پہنچنے کے پروگرام میں تاخیر کی کوشش پر ڈاکٹر احمد فاروق کا غصہ اور پیچ و تاب' پھر لاہور میں تدفین کی جگہ کے فیصلے پر جماعت اسلامی کی قیادت اور مولانا کے پس ماندگان کے مابین شدید کشمکش بلکہ محاذ آرائی اور باہمی تو تکار تک نوبت' اور بالآخر مولانا محمد یوسف (امیر جماعت اسلامی ہند) کی کوششوں سے تصفیہ — اور تدفین کے بعد مولانا کے چھ صاحبزادوں کی مشترکہ پریس کانفرنس جس میں انہوں نے جماعت اسلامی کے ذمہ دار لوگوں پر شدید الزامات عائد کئے وغیرہ ایسے واقعات ہیں جن کا کوئی ہلکا سا اندازہ بھی مجھے اُس وقت نہ تھا۔

بفلو سے شکاگو واپسی کے سفر میں میٹرک کے زمانے میں پڑھی ہوئی ایک انگریزی نظم "نغمہ زندگی" (PSALM OF LIFE) میری یادداشت کے زیریں حصے سے رفتہ رفتہ ابھر کر ذہن کی سطح پر تیرنے لگی۔ میں اس نظم کا ایک بند سورۃ العصر کے درس میں لفظ "عصر" کی تشریح کے ضمن میں اردو کے اس شعر کے ساتھ ساتھ کہ۔

"غافل تجھے گھڑیال یہ دیتا ہے منادی
گردوں نے گھڑی عمر کی اِک اور گھٹا دی!"

پڑھا کرتا تھا۔ یعنی

Art is long and time is fleeting
And our hearts though stout and brave
Still, like muffled drums are beating
Funeral marches to the grave

لہٰذا اس نظم کا یہ بند تو مجھے یاد تھا لیکن باقی نظم قطعاً یاد نہ تھی۔ اور بعض مواقع پر میں نے حافظے پر زور دے کر یاد کرنا چاہا تو بھی یاد نہ کر سکا تھا۔ لیکن اُس وقت جو کیفیت

قلب و ذہن پر طاری تھی اس کے زیر اثر وہ پوری نظم از خود میری یادداشت کی گہرائیوں سے ابھر آئی اور پورے سفر کے دوران میرے ذہن پر چھائی رہی!

Tell me not in mournful numbers,
Life is but an empty dream
For the soul is dead that slumbers,
And things are not what they seem
Life is real, life is earnest,
And the death is not its goal,
"Dust thou art, to dust returnest"
Was not spoken of the soul.

اس کے بعد وہ بند ہے جو اوپر نقل ہوا ـــــ اور پھر:

Let us then be up and doing,
With a heart for any fate,
Still acheiving, still pursuing,
Learn to labour and to wait.

Lives of great men all remind us,
We can make our lives subline,
And departing leave behind us,
Footprints on the sands of time.

Footprints, that perhaps another,
Sailing over life's solemn main,
A ship-wrecked and forlorn brother
Seeing may take heart again.

الغرض ان احساسات اور کیفیات کے ساتھ بفلو سے شکاگو واپسی ہوئی۔ وہاں ۲۳/ اور ۲۴/ کے دو دنوں کے دوران کچھ مفصل ملاقاتوں اور کچھ درس قرآن کی محفلوں کے بعد ۲۵ کو ٹورنٹو واپس آنا ہوا۔ اگرچہ اب اس مراجعتِ ٹورنٹو کا اصل مقصد فوت ہو چکا تھا۔ تاہم چونکہ پروگرام اسی طرح بنا تھا اور میرا سامان وہیں رکھا تھا' لہٰذا وہاں جانا ضروری تھا۔ وہاں سے ۲۷ کو نیویارک واپسی ہوئی جہاں مولانا یوسف

اصلاحی (رام پور۔ انڈیا) کی زبانی معلوم ہوا کہ شدید ردّوقدح اور تلخی و محاذ آرائی کے بعد بالآخر مولانا کی تدفین ان کے مکان واقع ۵۔ اے ذیلدار پارک 'اچھرہ' لاہور ہی کے بیرونی پلاٹ میں ہوئی جہاں وہ کم و بیش تیس سال تک عصر اور مغرب کی نمازیں باجماعت ادا کرتے رہے تھے — اس پر ایک عجیب سا خیال ذہن میں آیا کہ اچھرہ بھی عجیب بستی ہے' اس میں مین فیروز پور روڈ کی ایک جانب تقریباً اتنے ہی فاصلے پر علامہ عنایت اللہ مشرقی مدفون ہیں جتنے فاصلہ پر سڑک کی دوسری جانب اب مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی قبر ہے اور ذرا آگے چلئے تو سڑک کی ایک جانب شاہ جمالؒ کا مزار ہے تو دوسری جانب تقریباً اتنے ہی فاصلے پر شاہ کمالؒ کا — اگلے روز مولانا محمد ناظم ندوی مدظلہ' سے ملاقات کے دوران وہ حالات وواقعات علم میں آئے جن کا ذکر اوپر ہو چکا ہے تو میں نے خود اپنے آپ میں ایک ندامت سی محسوس کی' نہ معلوم کیوں!

نومبر کے پہلے ہفتے میں لاہور واپس پہنچ کر فوری اور ضروری امور سے فراغت کے فوراً بعد پہلی فرصت میں ۵۔ اے ذیلدار پارک اچھرہ حاضری ہوئی۔ ڈاکٹر احمد فاروق واپس امریکہ جا چکے تھے۔ مولانا مرحوم کے باقی پانچ صاحبزادوں سے اجتماعی ملاقات ہوئی' جو بحمد اللہ ہرگز رسمی نہ تھی۔ نماز مغرب کا وقت آیا تو سب نے باصرار مجھے ہی آگے بڑھایا۔ یہ دیکھ کر بہت اطمینان ہوا کہ مولانا کی قبر نہایت سادہ تھی اور اس کی نہ تو سطح ہی زمین سے زیادہ بلند تھی نہ ہی کسی اور تکلف یا تصنع کے کوئی آثار تھے — بہرحال مرقد سید پر سلام و دعا کے ساتھ دل ہی دل میں یہ شعر پڑھتے ہوئے واپسی ہوئی۔

"آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے
سبزۂ نو رستہ اس گھر کی نگہبانی کرے!"

مولانا مودودی مرحوم کے دوسرے صاحبزادے ڈاکٹر احمد فاروق مودودی نے

.بفلو میں جس انداز میں میرا استقبال کیا تھا اس کے ضمن میں احسان مندی کا گہرا نقش میرے دل پر قائم تھا اور خیال یہ تھا کہ لاہور میں ان سے ملاقات ہو گی تو ان کے شکریے کا جو قرض میرے ذمہ واجب الادا ہے ان کی خدمت میں پیش کر دوں گا — مزید بر آں انہوں نے جو یہ الفاظ کہے تھے کہ "اباجان بھی آپ سے ملاقات کے بہت خواہاں تھے!" تو اُس وقت تو رنج و غم کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں قلبی مسرت کی ایک بجلی سی ان کے ذریعے کوند گئی تھی لیکن بعد میں ان کے ضمن میں یہ احساس رہا کہ "آنچہ می بینم بہ بیداری است یارب یا بخواب؟" لہٰذا ان کی بھی توثیق کی خواہش دل میں تھی' چنانچہ اگلے سال جب پھر امریکہ اور کینیڈا کا سفر ہوا تو ۳ ستمبر ۸۰ء کو میں ٹورنٹو کے دو احباب سمیع اللہ خاں اور محمد نجم طاہر کی معیت میں .بفلو حاضر ہوا۔ اور میری حیرانی اور احسان مندی میں مزید اضافہ ہوا کہ اس بار میرا استقبال اور بھی زیادہ گرم جوشی سے ہوا۔ دن کا کھانا بھی میں نے ڈاکٹر احمد فاروق مودودی ہی کے ساتھ کھایا جنہوں نے میری خاطر ہسپتال سے نصف یوم کی رخصت لے لی تھی۔ اس موقع پر ایک تو میں نے ان کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا اور صاف بتا دیا کہ "میں تو گزشتہ سال ذہناً اس کے لئے بھی تیار ہو کر آیا تھا کہ آپ مجھے گھر میں داخل ہونے سے روک دیں' لیکن جو پذیرائی آپ نے میری اس موقع پر کی اس کے لئے حسب فرمانِ نبوی ؐ "مَنْ لَمْ يَشْكُرِ النَّاسَ لَا يَشْكُرُ اللّٰه!" جو شکریہ میرے ذمے تھا اس وقت تو میں اسے شدتِ جذبات سے مغلوبیت کے باعث ادا نہ کر سکا تھا' اب یہ پورا سفر اسی قرض کی ادائیگی کے لئے کیا ہے — ثانیاً میں نے احباب ٹورنٹو کی موجودگی میں ان سے ان متذکرہ بالا الفاظ کی توثیق حاصل کی جو اَب میرے لئے سرمایۂ صد افتخار ہیں۔ ثالثاً تحریک اسلامی اور اس کے مستقبل کے بارے میں مفصل گفتگو ہوئی تو اندازہ ہوا کہ مولانا کے صاحبزادگان میں سے کم از کم ڈاکٹر احمد فاروق بھرپور تحریکی مزاج کے حامل ہیں۔ لیکن بعض طالع آزما لیڈروں نے جو معاملہ ان کے ساتھ کیا اور اولاً ان کے قیامِ کراچی اور وابستگیٔ جمعیت کے دوران اور پھر امریکہ میں ان کی کردار کشی کی جو مہم

چلائی اس نے ان کے مزاج میں زہر کی تلخی بھی گھول دی ہے اور مایوسی کی تاریکی بھی!! ـــــ ورنہ وہ اعلیٰ دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی فہم' تحریکی شعور اور پابندیٔ صوم و صلوٰۃ ہر اعتبار سے نہایت قیمتی آدمی ہیں۔ میں نے ہرچند انہیں آمادہ کرنا چاہا کہ وہ پاکستان مراجعت اختیار کریں اور اپنے والد مرحوم کے مشن کو خود اپنے فہم و شعور کے مطابق جاری رکھنے کے لئے اپنے دوسرے بھائیوں کے تعاون سے آگے قدم بڑھائیں لیکن محسوس یہی ہوا کہ انہیں بعض مشہور و معروف حضرات سے بالکل آمنے سامنے کے تصادم (CONFRONTATION) کا شدید اندیشہ ہے جس کے باعث وہ عافیت پاکستان سے دور رہنے ہی میں محسوس کرتے ہیں۔ بہرحال جو کچھ اس روز ان سے سننے میں آیا اس کو جوں کا توں نقل کرنا نہ تاحال زبان کے لئے ممکن ہے نہ قلم کے لئے ـــــ گویا ع "مصلحت نیست کہ از پردہ بروں آید رازا" والا معاملہ ہے۔ تاہم اسقدر کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگرچہ میں جماعت اسلامی کے ناقدین میں غالباً اب (بعض دوسرے بزرگوں کی مصلحت آمیز خاموشی کے باعث) سرِفہرست ہوں اور اس کوچے کا بدنام ترین فرد سمجھا جاتا ہوں لیکن بایں رسوائی و بدنامی ان باتوں کے عُشرِ عشیر کا علم تو درکنار سان گمان تک نہیں رکھتا تھا جو اُس روز ڈاکٹر احمد فاروق مودودی کے ذریعے میرے علم میں آئیں ـــــ اور جن کا ماحصل علامہ اقبال مرحوم کے اس شعر کو قرار دیا جاسکتا ہے کہ۔

"خداوندا یہ تیرے سادہ دِل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیّاری ہے سلطانی بھی عیّاری!"

ـــــ ویسے حال ہی میں جو مقدمہ بازی (کالعدم) جماعت اسلامی کے متعدد مرکزی رہنماؤں اور مولانا مرحوم کے چوتھے صاحبزادے حسین فاروق مودودی کے مابین شروع ہوئی ہے اور جس نوع کے بیانات مولانا کے پانچویں صاحبزادے حیدر فاروق مودودی کی جانب سے اخبارات میں شائع ہوئے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید وہ وقت اب زیادہ دور نہیں کہ ع

"سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہو گا!"

میرے لئے ڈاکٹر احمد فاروق مودودی کی ملاقات اور گفتگو سے حاصل شدہ معلومات کا اہم ترین پہلو یہ تھا کہ ان جملہ اطلاعات کی توثیق ہو گئی جو مجھ تک اِدھر اُدھر سے پہنچتی رہی تھیں اور جن کے باعث دل میں شدید تمنا پیدا ہوئی تھی کہ امریکہ میں مولانا سے ملاقات کی جائے۔ (ان کا تفصیلی ذکر آئندہ آئے گا!)

بہرحال ڈاکٹر احمد فاروق مودودی سے جو ذہنی و قلبی رابطہ ان دو ملاقاتوں کے ذریعے استوار ہوا تھا اس کی مزید تقویت اور آبیاری کے لئے میں نے اگلے سال یعنی ۸۱ء میں امریکہ کے تیسرے سفر کے موقع پر ملاقات کی سبیل اس طرح نکالی کہ ادھر انہیں بھی دعوت دی کہ وہ نیاگرا آجائیں اور ادھر ٹورنٹو سے میں خود بھی عزیزم عاکف سعید سلمہ' اور دو احباب یعنی ڈاکٹر نسیم اللہ اور جناب بیگ صاحب کی معیت میں منگلوار ۱۶/ جون کو نیاگرا پہنچ گیا' جہاں ان سے کئی گھنٹے کی ملاقات اور گفتگو رہی۔

باب دوم

مولانا مودودی مرحوم کے ساتھ میرے تعلق کا ابتدائی دَور

(شائع شدہ "میثاق" اکتوبر ۸۲ء)

مولانا مودودی مرحوم و مغفور سے میرے تعارف کی ابتداء جیسا کہ میں اس سے قبل بھی بعض مواقع پر عرض کرچکا ہوں' ۴۶-۱۹۴۵ء میں ہوئی تھی جبکہ میں حصار (مشرقی پنجاب' حال ہریانہ' بھارت) میں ہائی اسکول کا طالب علم تھا۔ اُس وقت میرے شعور یا نیم شعور' جو بھی اسے قرار دیا جائے' پر اصل تسلّط تو علامہ اقبال مرحوم کی مِلّی شاعری اور مسلم لیگ کی قومی تحریک کا تھا۔ چنانچہ عملاً میں حصار ڈسٹرکٹ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن سے ایک فعال کارکن کی حیثیت سے وابستہ تھا لیکن کچھ ابتدائی کتابچے مولانا مودودی کے بھی میں نے پڑھ لئے تھے اور ان سے ایک گہرا تأثر بھی میرے ذہن نے قبول کیا تھا۔ میرے بڑے بھائی اظہار احمد جو ان دنوں میکلیگن انجینئرنگ کالج لاہور میں زیرِ تعلیم تھے مولانا مودودی کی تصانیف کا مطالعہ بِالاستیعاب کر رہے تھے۔ موسم گرما کی تعطیلات کے دوران میں انہیں اکثر مولانا کی تصانیف کا مطالعہ کرتے اور خالص طالب علمانہ انداز میں نوٹس تیار کرتے دیکھتا تھا۔ چنانچہ یہی کام کچھ ان کے "دیکھا دیکھی" اور کچھ اپنے ذاتی شوق کے باعث میں بھی کرتا تھا ــــ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن اور مسلم لیگ کے حلقوں میں جب مولانا مودودی پر تنقید ہوتی تھی تو میں ان کی جانب سے مدافعت کی کوشش کیا کرتا تھا' اگرچہ عملاً میری کامل وابستگی فیڈریشن اور لیگ ہی کے ساتھ رہی۔

حصار میں ان دنوں چوہدری نذیر احمد مرحوم اور مرزا مسرت بیگ مرحوم جماعت

اسلامی کے فعال اور سرگرم کارکن تھے۔ میرا ان دونوں ہی حضرات کے یہاں آنا جانا تھا۔ چوہدری صاحب کے فرزندِ کلاں ڈاکٹر ظہور احمد سے جو آجکل جہانیاں ضلع ملتان میں مطب کرتے ہیں، میرا کافی گہرا دوستانہ تھا—— ان ہی دنوں حصار میں جماعت اسلامی نے ایک درسگاہ قائم کی تھی جس کے سلسلے میں کچھ عرصہ کے لئے مولانا صدر الدین اصلاحی بھی حصار میں مقیم رہے تھے۔ ان کی بھی اس زمانے کی ایک ہلکی سی جھلک میرے حافظے کے کسی گوشے میں تاحال محفوظ ہے۔

فیڈریشن کی تنظیم کے سلسلے میں میرا ضلع حصار کے دوسرے قصبات خصوصاً سرسہ اور ہانسی بھی جانا آنا رہتا تھا۔ سرسہ میں میرے قریبی اعزہ کا ایک خاندان آباد تھا۔ یعنی میرے والد مرحوم کے حقیقی ماموں جن کے دو صاجزادگان ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی اور الطاف حسن قریشی جو "اردو ڈائجسٹ" کے حوالے سے مشہور و معروف ہیں، ان کے ایک برادرِ بزرگ حافظ افروغ حسن ان دنوں جماعت اسلامی میں باضابطہ بطورِ رکن شامل ہو چکے تھے۔ بنابریں اس گھرانے میں جماعت اسلامی اور مولانا مودودی کا بہت چرچا تھا۔ اس ناطے میرا ذہنی تعلق مولانا مودودی کے ساتھ مزید گہرا اور پختہ ہوا۔ سرسہ کے قریب ہی جماعت اسلامی کے رفقاء نے "دارالاسلام" پٹھانکوٹ کے طرز پر ایک مثالی بستی گویا منی (MINI) دارالاسلام قائم کی تھی جس کی روحِ رواں حکیم عبداللہ روڑوی مرحوم و مغفور تھے۔ میرا وہاں بھی اکثر آنا جانا رہتا تھا۔ اور اس کی بعض جھلکیاں بھی میری یادداشت میں تاحال محفوظ ہیں!

۴۶ء کی تعطیلاتِ موسم گرما کے ایک یادگار سفر کا مختصر ذکر میں اس روداد میں کر چکا ہوں جو جنوری فروری ۸۰ء کے میثاق میں شائع ہوئی تھی اور جس کا حوالہ اس تحریر کے آغاز میں بھی آچکا ہے۔ اس کے دوران، میں نے بھائی اظہار صاحب کی معیت میں دو یا تین دن دارالاسلام، پٹھانکوٹ، میں بھی بسر کئے تھے۔ اس کی بھی جو یادیں اب تک حافظے میں محفوظ ہیں ان میں سے حسب ذیل قابل ذکر ہیں :

مولانا امین احسن اصلاحی کا درسِ قرآن نماز فجر کے بعد ہوتا تھا۔ اس میں فضا بالعموم بہت بوجھل ہوتی تھی اور نہ صرف یہ کہ علمی وقار و متانت کا رنگ غالب رہتا تھا بلکہ رعب اور دبدبے کی کیفیت قائم رہتی تھی۔ جبکہ مولانا مودودی کا جو درسِ حدیث نماز ظہر کے بعد ہوتا تھا اس میں ماحول بالعموم شگفتہ رہتا تھا جس میں کبھی کبھی طنز و مزاح کا رنگ بھی شامل ہو جاتا تھا اور بالخصوص جناب عبدالعزیز شرقی اپنے دلچسپ سوالات کے ذریعے اس کے مواقع پیدا کرتے رہتے تھے۔ جن کے جواب میں اکثر "مولویوں" کی "مُوشگافیوں" پر طنز کا عنصر شامل ہو جاتا تھا۔

البتہ بالمشافہ ملاقات میں معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا۔ چنانچہ مولانا مودودی سے ملاقات آسان نہ تھی جبکہ مولانا اصلاحی سے ہر وقت ملا جا سکتا تھا۔ پھر گفتگو کے دوران بھی مولانا مودودی سے قدرے بُعد اور فاصلے کا احساس طاری رہتا تھا جبکہ مولانا اصلاحی بالکل "گھل مل" کر بات کرتے تھے۔ ایک فوری تقابل (SIMULTANEOUS CONTRAST) کا یہ نقشہ بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے کہ ہم نے ایک بار مولانا مودودی کے کمرے میں جھانکا تو اسے نہایت آراستہ پیراستہ پایا، فرش پر قالین بھی تھا، میز کرسی بھی ڈھنگ کی تھی اور ملاقاتیوں کے لئے بھی صوفہ موجود تھا۔ مولانا مودودی اُس وقت اپنی گردن گھومنے والی کرسی کی پشت پر ٹکائے، آنکھیں بند کئے کسی گہری سوچ میں مستغرق تھے۔ چنانچہ انہیں ہمارے دروازہ کھولنے اور اندر جھانکنے کی بالکل خبر نہ ہوئی اور ہم نے بھی مزید مخل ہونا مناسب نہ سمجھا ــــ جبکہ مولانا اصلاحی کے کمرے میں ایک نہایت سادہ سی میز تھی اور اسی قسم کی ایک کرسی جس پر مولانا تشریف فرما تھے۔ اور سامنے بھی ایک بوسیدہ سا بنچ تھا جس پر ملاقاتی بیٹھتے تھے۔ چنانچہ وہاں ہم دونوں بھائی کافی دیر تک بیٹھے مولانا سے باتیں کرتے رہے اور ہم نے مولانا سے کسی قسم کا بُعد یا فصل محسوس نہیں کیا۔

مولانا اصلاحی کے صاحبزادے ابو صالح مرحوم اور مولانا عبدالجبار غازی مرحوم و مغفور کے صاحبزادے عرفان غازی نے "دارالاسلام" میں روزمرہ کی ضروریات کی

ایک چھوٹی سی دکان کھولی ہوئی تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ہم نے بھی ان سے کچھ چیزیں بالکل "بلا ضرورت" خریدی تھیں۔

۴۷ء کے ہنگاموں اور فسادات میں ہم جن مراحل سے گزرے ان کی تفصیل تو ظاہر ہے کہ اِس وقت نہ ضروری ہے نہ ممکن۔ البتہ ان ایام کا ایک واقعہ میری آئندہ زندگی کے رخ کی تعیین کے اعتبار سے یقیناً بہت اہم ہے اور وہ یہ کہ جب ہم حصار میں ہندوؤں کے حملوں کے باعث "محصور" ہو گئے تو ان دنوں میں اور بھائی جان ایک مسجد میں "ترجمان القرآن" کے پرچوں میں شائع شدہ "تفہیم القرآن" کی اقساط کا مل جل کر مطالعہ کرتے تھے جن میں ان دنوں تفسیر سورۂ یوسف شائع ہو رہی تھی۔ میں نے اُن دنوں تازہ تازہ میٹرک کا امتحان پاس کیا تھا جس میں سائنس کے ساتھ ساتھ عربی زبان بھی بطور مضمون پڑھی تھی اور کچھ اپنے ذاتی شوق اور زیادہ تر استاذِ محترم مولانا محمد حسن مرحوم و مغفور کی مشفقانہ محنت کے نتیجے میں اس میں خاصی استعداد بہم پہنچالی تھی۔ ادھر بھائی جان نے بھی اگرچہ میٹرک تو اسی طرح سائنس اور عربی دونوں کے ساتھ ہی کیا تھا لیکن چھ سال گزر جانے کے باعث ان کا عربی قواعد کا علم پرانا ہو چکا تھا' چنانچہ "عربی دانی" میں فی الوقت میرا پلڑا ان سے بھاری تھا۔ چنانچہ جب کسی معاملے میں بحث کی نوبت آجاتی تھی تو اکثر و بیشتر انہیں میری بات ماننی پڑتی تھی — بہرحال اصل قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ یہ میرا قرآن حکیم کے مطالب و معانی سے پہلا تعارف تھا جو سورۂ یوسف کی "تفہیم" کے ذریعے ہوا — اور یہ کہنا ہرگز غلط نہ ہو گا کہ اصلاً سورۂ یوسف کی اپنی چاشنی اور مٹھاس اور پھر ع "ذکر اُس پری وَش کا اور پھر بیان اپنا!" کے مصداق مولانا مودودی کے اندازِ تعبیر و تفہیم کو میرے قرآن حکیم کے ساتھ آئندہ ربط و تعلق کی استواری میں اہم دخل حاصل ہے جس کے لئے میں مولانا مودودی کا تازیست ممنونِ احسان رہوں گا۔

حِصار کی "محصوری" کے انڈین آرمی کے ہاتھوں زبردستی خاتے ـــ اور پھر کچھ عرصہ ایک نو تعمیر شدہ جیل میں قائم "کیمپ" میں گزار کر جب ہمارا خاندان آگ اور خون کے دریا عبور کرتے ہوئے حصار سے سلیمانکی ہیڈورکس تک ایک سو ستر میل کا فاصلہ بیس دنوں میں ایک پیدل قافلے کے ساتھ طے کر کے اپنے خوابوں کی سرزمین "پاکستان" پہنچا تو بھائی جان نے تو پہلے کچھ عرصہ مہاجرین کے کیمپوں میں جماعت اسلامی کی جانب سے ہونے والے امدادی کام میں صرف کیا اور پھر وہ ایس-ڈی-او محکمہ انہار کی حیثیت میں اپنی تقرری کا پروانہ لے کر پہلے چیچہ وطنی اور پھر پاکپتن چلے گئے اور میں کرشن نگر لاہور میں اپنے ایک عزیز کے مکان پر مقیم اور گورنمنٹ کالج لاہور میں ایف ایس سی (میڈیکل) میں داخل ہو گیا۔

ایف ایس سی کے دو سالوں کے دوران میں نے جماعت اسلامی کے کرشن نگر لاہور کے حلقہ ہمدردان میں نہایت تندھی اور سرگرمی سے کام کیا۔ بلکہ یہ کہنا ہرگز مبالغے پر مبنی نہیں ہے کہ اس حلقے کی اصل روحِ رواں میں ہی تھا۔ چنانچہ میں ہی اس کے ہفتہ وار اجتماعات کا اہتمام کرتا تھا اور اس میں مولانا مودودی کی تحریریں پڑھ کر سناتا تھا۔ اور میں نے ہی اس کا ایک "دار المطالعہ" قائم کیا تھا جس کا سائن بورڈ بھی خود اپنے ہاتھ سے تحریر کیا تھا ـــ گوالمنڈی میں واقع دفتر "کوثر" میں جو ہفتہ وار اجتماعات جماعت اسلامی لاہور کے ان دنوں ہوتے تھے ان میں بھی میں پابندی سے شرکت کرتا تھا اور وہاں گاہے بگاہے مولانا مودودی کی زیارت اور ان کے وہ "تبصرے" سننے کی سعادت بھی نصیب ہو جاتی تھی جو وہ مختلف حلقوں کی رپورٹوں پر کرتے تھے ـــ ریڈیو پاکستان سے "اسلام کا نظامِ حیات" کے عنوان سے جو پانچ تقریریں مولانا کی ان دنوں نشر ہوئیں ان کو ہم کرشن نگر کے چوک میں دریاں بچھا کر ایک جلسے کی صورت میں خود سننے اور دوسروں کو سنانے کا اہتمام کرتے تھے ـــ اغلباً اپریل ۴۸ء میں جماعت اسلامی کے زیر اہتمام پاکستان میں جو پہلا جلسۂ عام موہنی روڈ لاہور پر واقع خالصہ ہائی سکول کے میدان میں ہوا تھا اس میں میں نے پہلی بار مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کی

مفصل تقاریر براہ راست سنیں۔ مولانا مودودی کی تقریر کا عنوان تھا "مطالبۂ نظامِ اسلامی" اور اصلاحی صاحب کی تقریر کا موضوع تھا "آزادی کے اسلامی تقاضے" — اور ان دونوں بزرگوں کی ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو گھنٹوں کی تقریروں کے دوران میری آنکھوں کے کیمرے کے ذریعے ان کی اُس وقت کی شبیہوں کا جو عکس میرے شعور کی سطح پر مرتسم ہوا تھا وہ میرے ذہن کے "محافظ خانے" میں تاحال محفوظ ہے — تاہم اس وقت تک ان دونوں بزرگوں کے ساتھ تعلق کی نوعیت یہ تھی کہ اپنے اور ان کے مابین محبت و عقیدت کے انتہائی قرب کے باوصف مقام اور مرتبے کا طویل اور ناقابلِ عبور فاصلہ حائل معلوم ہوتا تھا اور دور سے ان کی زیارت کرتے ہوئے میں بالکل ایسے محسوس کرتا تھا جیسے کسی بلند و بالا فصیل کے دامن میں کھڑا سر اونچا کیے اس کی کسی بلند برجی کو دیکھ رہا ہوں۔

لیکن جلد ہی یہ فاصلے کم ہونے شروع ہو گئے۔ اس کا ایک سبب تو بالکل فطری اور ریاضیاتی تھا یعنی یہ کہ ۴۷ء میں میری عمر ۱۵ سال تھی اور مولانا مودودی کی ۴۴ سال۔ گویا کہ نسبت ایک اور تین کی تھی۔ لیکن ۶۰ء میں مولانا کی عمر ۵۷ برس کی تھی اور میری ۲۸ برس گویا نسبت کم ہو کر ایک اور دو کی رہ گئی — لیکن دوسرا اور اہم تر سبب یہ ہوا کہ بعض اسباب سے میں جماعت اسلامی اور جمعیت طلبہ کے حلقوں میں نمایاں ہو گیا اور اس طرح ان "اکابر" کی نگاہوں میں بھی آ گیا — اور اس طرح فاصلے کم ہوتے چلے گئے۔

ہوا یوں کہ جیسے ہی میں نے ایف ایس سی پاس کر کے کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج لاہور میں ایم بی بی ایس کلاس میں داخلہ لیا میں نے اپنی رہائش بھی کالج کے ہاسٹل میں منتقل کر لی اور اس طرح اب میرا رابطہ جماعت اسلامی کی بجائے اسلامی جمعیت طلبہ سے قائم ہو گیا۔ اور چونکہ مجھے مسلم اسٹوڈنٹس فیڈریشن میں کام کا خاصا عملی تجربہ حاصل تھا' لہٰذا میں جمعیت میں ایک دم فعال اور سرگرم ہو گیا اور سال اول کے

دوران ہی مجھے جمعیت لاہور کے حلقہ میڈیکل کالج کا ناظم بھی مقرر کردیا گیا۔ اور اکثر و بیشتر جمعیت کے اجتماعات میں درس قرآن کی ذمہ داری بھی میرے ہی سپرد ہونے لگی۔

اُدھر موسم گرما کی تعطیلات میں مَیں والدین کے پاس منٹگمری (حال ساہیوال) جاتا تھا تو وہاں کی مقامی جماعت کے ساتھ سرگرمی سے کام کرتا تھا اور میرے درس قرآن کا کچھ ایسا شہرہ جماعت کے قریبی حلقوں میں ہو گیا تھا کہ وہاں بھی تمام تر کم علمی اور نوعمری کے باوجود درس قرآن کی ذمہ داری مجھ ہی پر ڈالی جاتی تھی۔

۵۰ء میں مولانا مودودی نے پنجاب کے صوبائی انتخابات کے ضمن میں پورے صوبے کا تفصیلی اور طوفانی دورہ کیا تو اس کے سلسلے میں منٹگمری میں مَیں نے نہایت تندہی سے کام کیا۔ مجھے اب تک یاد ہے کہ روزنامہ "تسنیم" کا انتخابات نمبر میں نے تانگے پر لاؤڈ اسپیکر لگا کر اس میں شائع شدہ پنجابی نظمیں ترنّم سے پڑھتے ہوئے پورے شہر کا چکر لگا کر فروخت کیا تھا ـــ اور پھر جب مولانا مودودی اس دورے کے سلسلے میں منٹگمری تشریف لانے والے تھے تو میں نے برادرم نبی احمد خاں لودھی (جو اَب حکومت پاکستان کے شعبہ اطلاعات سے متعلق ہیں) کی معیت میں ایک کار پر لاؤڈ سپیکر نصب کر کے منٹگمری سے عارف والہ' وہاں سے پاکپتن اور پھر وہاں سے واپس منٹگمری کا تقریباً ایک سو میل کا سفر اس شان سے کیا تھا کہ پورے راستے کے دوران سڑک کے قریب کی تمام آبادیوں اور دیہات میں چھوٹی چھوٹی تقریریں کر کے لوگوں کو مولانا کے جلسے میں شرکت کی دعوت دی تھی' جس کا خاطر خواہ نتیجہ بھی بر آمد ہوا تھا اور دیہات سے کثیر تعداد میں لوگ مولانا کی تقریر سننے کے لئے منٹگمری آئے تھے ـــ یہ دوسری بات ہے کہ منٹگمری کے آس پاس کے دیہات کے باشندے' بالخصوص وہ جنہیں عرفِ عام میں "جانگلی" کہا جاتا ہے' مولانا کی شستہ اردو نہ سمجھ سکے اور مایوس ہو کر لوٹ گئے ـــ اس موقع پر میں نے مولانا مودودی کو برادرم علی احمد کے تعاون سے منٹگمری کے طلبہ کی جانب سے ایک عصرانہ بھی دیا تھا جس میں ایک باضابطہ "سپاسنامہ" بھی مولانا کی

خدمت میں پیش کیا گیا تھا' جو لکھا بھی میں نے تھا اور پڑھا بھی میں نے ہی تھا۔ (اور غالباً جماعت اسلامی کی تاریخ میں "سپاسناموں" کی "بدعت" کا آغاز اسی سے ہوا تھا جس پر بعد میں مجھے ہمیشہ شرمندگی کا احساس ہوتا رہا!)

اس موقع پر اوکاڑہ میں جو اجتماع جماعت اسلامی کے زیر اہتمام ہوا تھا اس میں بھی میں نے طلباء کا ایک علیحدہ اجلاس منعقد کرایا تھا جس میں میں نے مولانا کی موجودگی میں اپنی پہلی ارتجالی تقریر کی' جس سے مولانا بہت خوش ہوئے اور انہوں نے اس کی دل کھول کر تحسین فرمائی اور اس طرح میں ذاتی طور پر ان کی نگاہوں میں آتا چلا گیا۔

۵۱ء میں جب الیکشن بالفعل منعقد ہوئے تو وہ میرے میڈیکل کی تعلیم کے دوران کے مشکل ترین امتحان (یعنی فرسٹ پروفیشنل) کے دن تھے۔ لیکن پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کی جو دھن اس زمانے میں جماعت اور جمعیت کے ہر رکن اور کارکن پر سوار تھی اس کے زیر اثر میں نے بھی رات دن ایک کر کے محنت کی اور اپنی تعلیم اور کیریر کے کسی خیال کو ذہن کے قریب نہ آنے دیا۔ لیکن پھر جب اس میں جماعت کو شدید ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تو کچھ اس کے صدمے کے باعث اور کچھ اس لئے کہ اس کے فوراً بعد رمضان المبارک کا مہینہ آگیا اور اس کے فوراً بعد امتحان ہوا' میری صحت جواب دے گئی۔ اور ابھی امتحان کے تحریری پرچے ہی ہوئے تھے اور پریکٹیکل باقی تھے کہ مجھ پر ٹائیفائڈ کا حملہ ہو گیا۔ نتیجہ اس کے باوجود کہ تحریری پرچوں میں میں نے پوری کلاس میں اول پوزیشن حاصل کی تھی' مجھے پورا امتحان (ستمبر ۵۱ء میں) دوبارہ دینا پڑا۔ (اور الحمدللہ کہ یہ میرے پورے تعلیمی کیریر کا اپنی نوعیت کا واحد واقعہ ہے!)۔

اواخر ۵۱ء سے اواخر ۵۳ء تک' دو سال کا عرصہ میرے مولانا مودودی سے انتہائی قرب کا زمانہ ہے۔ جس کے دوران مجھ پر مولانا کی بزرگانہ شفقتیں اور مربیانہ

عنایتیں اس حد کو پہنچ گئیں کہ عمر اور مقام و مرتبے کے "بُعد المشرقین" کے علی الرغم بے تکلفی کا عالم یہ ہو گیا کہ "باہمی" گفتگو میں طنز و مزاح کا استعمال بھی "دو طرفہ" ہونے لگا۔

نومبر ۵۱ء میں اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان کے سالانہ اجتماع کے موقع پر جو جلسۂ عام وائی۔ایم۔سی۔اے ہال لاہور میں منعقد ہوا، اس میں جو تقریر میں نے مولانا امین احسن اصلاحی کی زیر صدارت کی اس کا جمعیت اور جماعت کے حلقوں میں بہت شہرہ ہوا۔ خود مولانا اصلاحی نے اس کی نہایت دل کھول کر تحسین و تعریف کی۔ چنانچہ جماعت کے مرکز کے حلقے میں بھی اس کا بہت چرچا ہوا۔ (یہ تقریر طویل عرصے تک "ہماری دعوت اور ہمارا طریق کار" کے عنوان سے جمعیت کے دعوتی لٹریچر کا "جزوِ لاینفک" رہی۔ اور اغلباً اب بھی ہے!)

غالباً یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ اواخر دسمبر ۵۱ء میں جب میں نے لاہور میں جمعیت کے زیر اہتمام ایک "تربیت گاہ" منعقد کی جس میں درس قرآن مولانا اصلاحی نے دیا اور درس حدیث مولانا مودودی نے، تو اس کے بالکل آغاز ہی میں مَیں نے محسوس کر لیا کہ مولانا مودودی کے دل میں میرے لئے شدید محبت و شفقت موجود ہے اور میں ان کی خصوصی توجہ اور التفات کا مرکز ہوں۔ میرے لئے اس احساس میں جو سرور اور کیف مضمر تھا اس کا اندازہ ہر شخص بآسانی کر سکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میری زندگی کے وہ دس دن جو ۲۲/ تا ۳۰/ دسمبر ۵۱ء ان بزرگوں کی شفقت و عنایت کے سائے میں بسر ہوئے "حاصلِ زیست" نہیں تو ایک متاعِ گرانمایہ ضرور ہیں۔ اس لئے کہ ایک تو انہی دنوں کے دوران میرا "تدبرِ قرآن" کے فراہی "مکتبِ فکر" سے ابتدائی تعارف ہوا ــــ اور دوسرے ان ہی ایام کے قربِ پیہم کے نتیجے میں مولانا مودودی سے "بے تکلفی" کا آغاز ہوا، اور بُعد و فصل کے سارے حجابات اٹھتے چلے گئے۔

مولانا مودودی کی جانب سے بے تکلفی کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ایک روز میں نے مولانا سے عرض کیا کہ "آج آپ ہمیں اپنے کچھ حالاتِ زندگی سنایئے!"

تو مولانا نے بے ساختہ فرمایا "گویا آپ لوگ چاہتے ہیں کہ میں اپنا مولود شریف خود پڑھوں!" جس پر ایک فرمائشی قہقہہ پڑا۔

اِدھر اپنی بے تکلفی یا "کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ" کے مصداق "گستاخی" کی یہ مثال قابلِ ذکر ہے کہ تربیت گاہ کے آخری دن ہم نے جملہ اساتذہ اور مربّی حضرات کے لئے دعوتِ طعام کا اہتمام کیا— تو جب میں نے مولانا مودودی سے اس کا ذکر کیا اور انہیں شرکت کی دعوت دی تو انہوں نے فرمایا : "اچھا— لیکن پھر میں بھی کوئی چیز لے کر آؤں گا!"— اس پر میں نے بلا جھجک کہا کہ "اگر یہ بات ہے تو پھر ہم لوگ مرغی پکار ہے ہیں' آپ بھی کوئی مقابلے کی چیز لے کر آیئے گا!" اگرچہ مولانا نے "مجھے اس کا یہ بھرپور" جواب دے کر محفل کو زعفران زار بنادیا کہ "مرغی کے مقابلے کی چیز تو بِلّی ہے!"—

نومبر ۵۱ء کے سالانہ اجتماع میں مجھ پر جمعیت کی دو اہم ذمہ داریوں کا بوجھ ڈال دیا گیا تھا۔ ایک جمعیتِ لاہور کی نظامت کا— اور دوسرے جمعیتِ پنجاب کی نظامت کا — اور واقعہ یہ ہے کہ اس سال میں نے جس جوش و خروش اور تندہی سے کام کیا اس کا تصور اب کرتا ہوں تو خود مجھے حیرت ہوتی ہے۔ جمعیت اگرچہ قائم بھی لاہور ہی میں ہوئی تھی اور وہیں کئی سال تک اس کا مرکز قائم رہا تھا لیکن اُس وقت تک لاہور میں اس کی حیثیت طلبہ کے ایک لٹریری سرکل سے زیادہ نہ تھی۔ اور بقیہ پنجاب میں تو اس کا کہیں نام و نشان تک موجود نہ تھا۔ لے دے کر صرف راولپنڈی میں ایک جمعیت تھی جو کبھی ماضی میں کسی قدر فعال رہی تھی لیکن اس وقت اس کے صرف کچھ "آثار" باقی تھے اور وہ بھی نہایت خستہ اور بوسیدہ حالت میں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سال قبل جمعیت کا مرکز لاہور سے کراچی منتقل ہو گیا تھا۔ گویا یہ تسلیم کر لیا گیا تھا کہ پنجاب میں جمعیت نیم مردہ حالت میں ہے۔ لیکن الحمدللہ کہ میں نے جیسے ہی اس کا چارج سنبھالا اس میں زندگی کے آثار ظاہر ہونے شروع ہو گئے— چنانچہ میں نے "تربیت گاہ" سے فارغ ہوتے ہی جنوری ۵۲ء میں پورے پنجاب کا ایک طوفانی دورہ

کیا‘ جس کے دوران کا ایک واقعہ تو بہت ہی دلچسپ اور قابلِ ذکر ہے۔

ہوا یوں کہ میں اور برادرم نذیر احمد خالد (جو مجھ سے دو سال جونیئر تھے — اور آج کل ایک غیر ملکی دوا ساز فرم میں اہم عہدے پر فائز ہیں) سیالکوٹ کے دورے کے لئے صبح چار بجے لاہور سے نکلے۔ طے یہ تھا کہ سکولوں میں تقریریں وہ کریں گے اور کالجوں میں مَیں کروں گا۔ انہوں نے اپنی تقریر خوب محنت سے تیار بھی کرلی تھی۔ لیکن سیالکوٹ میں جب پہلے ہائی اسکول میں جلسہ ہوا اور پانچ سات سو طلبہ اور پچیس تیس اساتذہ کا "ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر" ان کے سامنے آیا تو ان کی گھگھی بندھ گئی — اور چند جملے کہنے کے بعد وہ یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ بقیہ تقریر اسرار احمد صاحب کریں گے — میرے لئے ظاہر ہے کہ یہ ایک ناگہانی آفت سے کم نہ تھی لیکن الحمدللہ کہ میں نے صورتحال کو سنبھال لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ایک دن میں مَیں نے تین ہائی اسکولوں میں تقریریں کیں اور دو کالجوں میں۔ ایک قدیم مرے کالج (MURRAY COLLEGE) اور دوسرے جناح اسلامیہ کالج (جو ان ہی دنوں قائم ہوا تھا اور اس کا غالباً پہلا ہی سال تھا)۔ اور صورت یہ رہی کہ ایک درسگاہ سے نکلے تو فوراً دوسری میں جا داخل ہوئے۔ نتیجۃً پورے دن کچھ کھانے پینے کا نہ ہوش آیا نہ موقع ملا۔ شام کو چار بجے فارغ ہوئے اور خیال ہوا کہ اب کچھ "خورد و نوش" کا معاملہ ہوگا تو جناب آسی ضیائی رامپوری نے اطلاع دی کہ لاہور کے لئے آخری بس کی روانگی کا وقت ہو چکا ہے۔ چنانچہ اسی طرح خالی پیٹ لاہور واپسی ہو گئی‘ جہاں رات گئے پہنچنے کے باعث ہاسٹل کا کچن بند ہو چکا تھا۔ چنانچہ رات بھی ویسے ہی خالی پیٹ بسر ہوئی — بہرحال میری اس بھاگ دوڑ اور محنت و مشقت کا یہ نتیجہ نکلا کہ پنجاب میں جمعیت ایک دم فعال اور نمایاں ہو گئی۔ اور اب اس کی حیثیت طلبہ کے ایک مذہبی اور لٹریری سرکل سے بڑھ کر اسلامی تحریک کی ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ اس کی اطلاعات مولانا مودودی کو بھی پنجاب کے طول و عرض سے مل رہی ہوں گی۔ اور اس کے نتیجے میں ان کے دل میں میرے لئے شفقت و محبت کے جذبات بڑھ رہے ہوں گے‘ جس کا ایک

نمایاں اظہار بھی اُن ہی دنوں ہو گیا۔

فروری ۵۲ء میں میں نے لاہور میں جمعیت پنجاب کا ایک سہ ماہی اجتماع منعقد کیا۔ اور اس موقع پر برکت علی اسلامیہ ہال میں مَیں نے خود مولانا ہی کے زیر صدارت وہ تقریر کی جو جمعیت کے لٹریچر میں "ہم اور ہمارا کام" کے عنوان سے شامل ہے' تو مولانا نے اسے بہت سراہا۔ ان کے دو فقرے میری لوحِ قلب پر تاحال نقش ہیں ـــــ ایک یہ کہ "پاکستان کے طلبہ کے حالات کا جو نقشہ آپ نے کھینچا ہے وہ آپ ہی کی زبان سے موزوں تھا! یہی باتیں اگر ہم کہتے (واضح رہے کہ اس محفل میں مولانا اصلاحی بھی موجود تھے!) تو طلبہ کو شکایت ہو سکتی تھی" اور دوسرا یہ کہ "آپ نے اپنی اس تقریر میں جو کچھ کہا ہے ہم بھی اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتے۔ بس تھوڑا سا فرق صرف شخصیت کا باقی رہ جاتا ہے!" مجھے اُس وقت بھی پورا احساس تھا کہ مولانا یہ باتیں میری حوصلہ افزائی کے لئے فرما رہے ہیں لیکن بہرحال اس میں محبت و شفقت اور اپنائیت کے احساس کا جو رس گُھلا ہوا تھا میرے لئے اصل اہمیت اس کی تھی!۔

۵۲ء کی موسم گرما کی تعطیلات میں مَیں نے۔

"مشرف گرچہ شد جامی زِ لطفش
خدایا آں کرم بارے دگر کُن!"

کے مصداق دسمبر ۵۱ء کی تربیت گاہ کے لطف کو مکرر اور دوبالا کرنے کے لئے پھر ایک طویل تر تربیت گاہ منعقد کی اور ایک بار پھر مولانا امین احسن اصلاحی سے درسِ قرآن حاصل کیا اور تدبرِ قرآن کے اصول و مبادی سیکھے اور "تزکیۂ نفس" پر لیکچر سنے۔ اور مولانا مودودی سے درسِ حدیث حاصل کیا اور مختلف تحریکی مسائل پر تفصیلی گفتگوئیں سنیں۔ اور آزادانہ تبادلہ خیال ہی نہیں باقاعدہ بحث و تمحیص کے ذریعے دعوتی اور تحریکی معاملات میں بصیرت حاصل کی ـــــ اس دوسری تربیت گاہ کا یہ پہلو بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس کے دوران ہم نمازِ تہجد مولانا مودودی کی امامت میں ادا کرتے رہے ـــــ اور تہجد کے انوار و برکات سے متمتع ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا کی

دلآویز ترتیل سے محظوظ ہوتے رہے۔ اور اس کے دوران میرے لئے کسی قدر قابلِ فخر اور دوسرے ساتھیوں کے لئے حد درجہ قابلِ رشک بات یہ رہی کہ اکثر مولانا اپنے کمرے سے ننگے سر ہی آجاتے تھے اور پھر میری قراقلی ٹوپی پہن کر نماز پڑھاتے تھے ---(میری وہ ٹوپی بعد میں جمعیت کے احباب کے حلقوں میں بہت عرصے تک مشہور رہی!)

اب صحیح یاد نہیں کہ یہ واقعہ دسمبر ۵۱ء کی تربیت گاہ میں پیش آیا تھا یا ۵۲ء کی موسمِ گرما کی تعطیلات کی تربیت گاہ میں — لیکن ہے بہت دلچسپ اور قابلِ ذکر۔ اس کا پس منظر یہ ہے کہ ڈاروِن کے نظریۂ ارتقاء پر مولانا کی جو تحریر "تفہیمات" میں شامل ہے مجھے وہ پسند نہ تھی' چنانچہ میں نے اس پر تربیت گاہ کے دوران مولانا سے گفتگو کی اور ان کا نقطۂ نظر مزید وضاحت سے معلوم کیا۔ پھر میں نے مولانا اصلاحی صاحب سے بات کی تو انہیں کسی درجے میں نظریۂ ارتقا کا قائل پایا۔ بس یہاں سے میری "شرارت" شروع ہو گئی۔ میں روزانہ مولانا اصلاحی سے نظریۂ ارتقاء کے حق میں قرآنی دلائل اور استشہادات حاصل کر لیتا اور پھر مولانا مودودی سے ان کی بنیاد پر بحث کرتا۔ مولانا میرے اس "علمِ قرآنی" سے حیران بھی ہوتے اور اس کی تحسین بھی فرماتے اور پھر اپنے اعتراضات وارد کرتے۔ میں اگلے روز وہ اعتراضات مولانا اصلاحی کے سامنے رکھتا تو وہ بھی حیرت آمیز مسرت کا اظہار فرماتے اور اپنے موقف کے حق میں مزید دلائل دیتے۔ تربیت گاہ کے بقیہ تمام شرکاء ان بحثوں کو سنتے اور محظوظ ہوتے اور میری "قرآن دانی" پر زیرِ لب مسکراتے بھی رہتے!)۔ یہ سلسلہ کئی روز جاری رہا اور معلوم ہوتا ہے کہ اس کا چرچا جماعت کے مرکز میں بھی ہوا اور وہاں یہ راز کھل گیا کہ اصل معاملہ کیا ہے۔ یعنی یہ کہ یہ بحث طلبہ کے ساتھ نہیں بلکہ اصلاً مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کے مابین ہو رہی ہے' بواسطۂ اِسرار۔ چنانچہ جناب نعیم صدیقی نے ہمیں اس "شرارت" سے روکا۔ اور اس پر قدرے سرزنش بھی کی۔

بہرحال میری سال بھر کی بھاگ دوڑ اور محنت و مشقت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۵۲ء کے

اواخر میں جب اسلامی جمعیت طلبہ کا سالانہ اجتماع منعقد ہوا تو ایک تو اس موقع پر اجلاسِ عام کسی ہال میں نہیں بلکہ پہلی بار ایک کھلے میدان (یعنی گول باغ لاہور) میں ایک جلسہ عام کی صورت میں منعقد ہوا — اور دوسرے مجھے آئندہ سال (۵۲۔ ۵۳ء) کے لئے جمعیت کا آل پاکستان ناظمِ اعلیٰ منتخب کر لیا گیا۔ اور اس طرح ایک تو جمعیت کا مرکز دوبارہ لاہور منتقل ہو گیا اور دوسرے میرے مولانا مودودی سے مزید قریبی روابط کی راہ نکل آئی۔ اس لئے کہ مختلف تنظیمی اور تحریکی مسائل پر مشورہ اور رہنمائی حاصل کرنے کے لئے میں اکثر مولانا کی خدمت میں حاضر ہوتا رہتا' جہاں میرے لئے کوئی روک ٹوک نہ تھی' بلکہ جماعت کے مرکز کے اکثر کارکن اس پر حیرت کا اظہار بھی کرتے تھے اور کسی قدر رشک (یا حسد؟) میں بھی مبتلا تھے کہ اس کے باوجود کہ مولانا کی زندگی بہت منضبط تھی اور وہ اپنے اوقاتِ کار کی سختی سے پابندی نہ صرف خود کرتے تھے بلکہ دوسروں سے بھی کرواتے تھے' میرے لئے ان کا دروازہ ہر وقت کھلا تھا۔ یہاں تک کہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک بار میں اپنے چند ساتھیوں سمیت مولانا کی خدمت میں رات کے گیارہ بجے حاضر ہوا اور مولانا نے ہمیں اپنی خوابگاہ ہی میں شرفِ باریابی عطا فرمایا۔

فروری ۵۲ء میں منعقدہ اجتماعِ جمعیتِ پنجاب کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ اس کا ایک اور واقعہ بھی بہت اہم اور قابلِ ذکر ہے اور آگے بڑھنے سے قبل اس کا تذکرہ مناسب رہے گا — ہوا یہ کہ مولانا نے جو تقریر اُس روز میری تقریر کے بعد فرمائی اس میں یہ الفاظ بھی تھے کہ "میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ ایک جانب دعوتی اور تحریکی مشاغل میں بھرپور حصہ لیں — لیکن دوسری جانب اپنی تعلیم میں بھی دوسروں سے ہرگز پیچھے نہ رہیں بلکہ اس میدان میں بھی اپنے ساتھی طلبہ سے آگے رہیں —!" میں نے جب مولانا کی اس نصیحت کی روشنی میں اپنا جائزہ لیا تو محسوس کیا کہ یہ ایک ناقابلِ عمل بات ہے۔ چنانچہ میں اسی رات مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے تفصیل کے ساتھ عرض کیا کہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ سر آنکھوں پر' لیکن یہ ہے ناممکن العمل! — میں

نے پرائمری سے اُس وقت تک کا پورا ریکارڈ مولانا کے سامنے رکھ دیا کہ میں نے پرائمری میں بھی وظیفہ حاصل کیا تھا' پھر مڈل کے ورنیکلر فائنل کے امتحان میں بھی وظیفہ حاصل کیا' پھر میٹرک میں مَیں متحدہ پنجاب کے تمام مسلمان طلبہ میں چوتھے نمبر پر تھا اور میرے اپنے اسکول میں جو طالب علم میرے بعد دوسرے نمبر پر تھا اس کے اور میرے نمبروں میں ۹۰ کا فرق تھا (میں نے کُل ۸۵۰ میں سے ۷۱۸ نمبر حاصل کئے تھے اور اس نے ۶۲۸) بعد ازاں میں نے ایف ایس سی میڈیکل میں نمایاں پوزیشن حاصل کی اور میرٹ (MERIT) سکالرشپ حاصل کیا' پھر میڈیکل کالج میں فرسٹ ایئر میں مَیں کلاس میں اول رہا اور ایک مزید وظیفہ مجھے ملا (چنانچہ میڈیکل کالج کے سال دوم کے دوران میرے پاس دو وظائف تھے!) —— لیکن اب جمعیت کی گوناگوں ذمہ داریاں میرے کاندھوں پر آگئی ہیں ان کے پیش نظر میرے لئے ناممکن ہے کہ میں اپنی اس پوزیشن کو برقرار رکھ سکوں —— تو فرمایئے کہ میں کیا کروں؟ —— اس پر مولانا نے نہ صرف یہ کہ کھلے دل کے ساتھ اپنی غلطی کو تسلیم کیا بلکہ پوری صفائی کے ساتھ اعتراف فرمایا کہ —— "میرا اپنا حال یہ ہے کہ جب سے جماعت اسلامی کی تحریک عوامی دور میں داخل ہوئی ہے میرا مطالعہ بالکل منقطع ہو چکا ہے اور اب میں صرف اپنے سابقہ مطالعے سے کام چلا رہا ہوں!!" —— کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ مولانا کے الفاظ مجھے تاحال جوں کے توں کیسے یاد رہ گئے کہ میں انہیں واوین یعنی (IVERTED COMMAS) کے ساتھ نقل کر رہا ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ مولانا کے یہ الفاظ میرے لوحِ قلب پر کندہ ہیں' اس لئے کہ میری اپنی زندگی کے آئندہ رخ کی تعیین میں ان کو فیصلہ کن دخل حاصل ہے۔ اور میں نے اپنی زندگی میں دنیوی مستقبل (CAREER) اور پیشہ و فن (PROFESSION) کو ثانوی درجہ دینے اور دعوت و اقامتِ دین کی جدّوجہد کو اولیت دینے کا فیصلہ غیر شعوری طور پر نیم دلی کے ساتھ نہیں بلکہ پوری طرح جانتے بوجھتے اور خالص شعوری طور پر کیا تھا اور اس میں مولانا کے ان الفاظ کو بھی اہم دخل حاصل ہے —— !

۱۹۵۳ء کو پاکستان کی تاریخ میں انتہائی اہمیت حاصل ہے۔ اس لئے کہ اس کے دوران ایک جانب تو پاکستان کی عوامی سیاست کے میدان میں وہ عظیم ہنگامہ خیز تحریک برپا ہوئی جس نے ہمیشہ کے لئے پاکستانی سیاست کی گاڑی کو پٹڑی سے اتار کر رکھ دیا۔ چنانچہ پاکستان میں پہلی بار ایک محدود پیمانے پر مارشل لاء نافذ ہوا۔ اور دوسری طرف پاکستانی طلبہ میں بھی بائیں بازو کے عناصر نے عظیم ترین ہل چل پیدا کی جس کے نہایت دُور رَس اثرات مترتب ہوئے۔

۵۳ء کی اینٹی قادیانی تحریک کا آغاز تو مجلسِ احرار کے ان زعماء نے کیا تھا جو ۴۷ء میں قیامِ پاکستان کی صورت میں جو شکست فاش انہیں ہوئی تھی اس کے زیر اثر پورے چھ سال منقار زیرِ پَر رہے تھے اور اب اچانک اینٹی قادیانی تحریک کا علم اٹھائے منظرِ عام پر ظاہر ہوئے تھے ــــ لیکن بعد میں اس میں دوسرے مذہبی عناصر بھی کچھ دلی آمادگی کے ساتھ اور کچھ مجبوراً شامل ہوتے چلے گئے۔ دلی آمادگی کے ساتھ شامل ہونے والوں میں سرِفہرست حلقہ دیوبند کے وہ علماء کرام تھے جو مولانا حسین احمد مدنیؒ کی زیر قیادت کانگرس کے ہمنوا رہے تھے ــــ اور حالات کے دباؤ کے تحت شامل ہونے والوں میں نمایاں اولاً حلقہ دیوبند کے مسلم لیگی علماء اور ثانیاً بریلوی مکتب فکر کے علماء و زعما تھے ــــ جماعت اسلامی اور مولانا مودودی اس معاملے میں بالکل ع "نے تابِ وصل دارم نے طاقتِ جدائی!" والے مخمصے میں مبتلا ہو گئے تھے' اس لئے کہ جماعت کی تاسیس جن اصولی نظریات کی بنیاد پر ہوئی تھی ان کی رو سے اس کا اس تحریک میں حصہ لینا کسی طور سے صحیح نہ بنتا تھا۔ لیکن سیاسی اکھاڑے میں اتر جانے کے باعث عوامی دباؤ کو بالکل نظرانداز کر دینا بھی اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ چنانچہ اس کا معاملہ مسلسل "نیمے دروں نیمے بروں" کا رہا' یعنی یہ کہ "بظاہر" تحریک میں شامل بھی ہیں لیکن "بباطن" اس سے علیحدہ اور بری بھی!! ــــ بہرحال اِس وقت پیش نظر اس طویل اور تلخ داستان کی تفصیل بیان کرنا نہیں بلکہ اس واقعے کا اظہار ہے کہ اُس

زمانے میں میرا نہایت قریبی رابطہ مولانا سے قائم رہا اور اس پورے معاملے کے دوران کی نشیب و فراز کا علم مجھے بہت قریب سے ہوتا رہا۔ مجھے خوب اچھی طرح یاد ہے کہ جس روز "متحدہ مجلسِ عمل" نے "راست اقدام" یعنی "Direct Action" کے آغاز کا اعلان کیا اور جماعت اسلامی کی جانب سے یہ بیان اخبارات میں شائع ہوا کہ ہم اس راست اقدام میں تو شریک نہیں ہیں "البتہ ہم نے اپنے حصے کا کام اپنے ذمے لے لیا ہے" اس روز میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ بہت خوش اور ہشاش بشاش تھے اور میں نے پہلی بار ان کی زبان سے انگریزی کا ایک محاورہ سنا۔ مولانا نے فرمایا: "ہم اس پوری صورت حال سے With Flying Colours نکلے ہیں!" ـــــ لیکن افسوس کہ مولانا کی یہ خوش فہمی بہت عارضی ثابت ہوئی اور نہ صرف یہ کہ حکومت کے "جوابی اقدام" کی لپیٹ میں دوسرے علماء و زعماء کے ساتھ ساتھ مولانا بھی آگئے بلکہ وقت کے بعض "فراعنہ" نے جو موقع کی تاک ہی میں تھے بھرپور وار کیا اور مولانا پر مارشل لاء کے تحت فوجی عدالت میں مقدمہ قائم کر دیا۔

یہ زمانہ 'جمعیت اور جماعت کے ہزاروں کارکنوں کی طرح مجھ پر بھی رنج و غم کی شدت اور حزن و ملال کے غلبے کا تھا۔ (۵۳ء کو عہدِ حاضر کی اس اسلامی تحریک کا جو جماعت اسلامی کے تحت جاری تھی "عام الحزن" قرار دیا جائے تو یہ بات غلط نہ ہوگی!) جب تک لاہور سنٹرل جیل میں مقدمے کی سماعت جاری رہی میں روزانہ وہاں جاتا رہا ـــــ اور مقدمے کی کارروائی سننے کے ساتھ مولانا کی زیارت سے مشرف ہوتا رہا اور ان کے صبر و سکون سے خود اپنے جذبے اور ولولے کے لئے حرارت حاصل کرتا رہا۔ چوہدری نذیر احمد مرحوم کا "دفاع" میرے اندازے میں اتنا جاندار نہ تھا جتنی توقع تھی ـــــ جبکہ سرکاری وکیل (غالباً اعوان صاحب) کا آخری جوابی حملہ بہت زوردار تھا۔ اور میرا دل اسی وقت ڈوب سا گیا تھا۔ تاہم جب تک فیصلے کا اعلان نہ ہوا ایک امید سی قائم رہی ـــــ لیکن جب پھانسی کی سزا کا اعلان ہوا تو اعصاب پر بجلی سی گری اور

ایک بار تو دنیا اندھیر ہو گئی! اُس وقت جو کیفیت ہم سب کی تھی وہ ناقابلِ بیان ہے۔ تاہم مایوسی کے اس غلبے اور رنج و غم کے اس گھٹاٹوپ اندھیرے میں ہم سب کے لئے جو چیز نہایت ہمت افزا اور حد درجہ حوصلہ بخش تھی وہ یہ کہ مولانا نے پھانسی کی سزا کا حکم بھی نہایت صبر و سکون کے ساتھ سنا اور بعد میں بھی پھانسی کے سزا یافتہ قیدیوں کے مخصوص کپڑے پہننے سے لے کر کال کوٹھڑی میں داخل کئے جانے اور وہاں موت کے انتظار کے صبر آزما لحات میں کسی بھی مرحلے پر ان کے پائے ثبات میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوا۔

میں اُن دنوں لاہور سے جمعیت کے زیر اہتمام پندرہ روزہ "عزم" شائع کیا کرتا تھا جس کی ادارت کے فرائض میں اور ڈاکٹر سید اسلم (حال، اسسٹنٹ پروفیسر، انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیو وسکلر ڈیزیز، کراچی) مشترکہ طور پر سرانجام دیتے تھے۔ میں نے اس موقع پر اس میں ایک تو حضرت جگر مراد آبادی کی وہ غزل شائع کی جو ایسے محسوس ہوتا تھا کہ خاص اسی موقع کے لئے کہی گئی تھی۔

یہ صحن و روش یہ لالہ و گل ہونے دو جو ویراں ہوتے ہیں
تخریبِ جنوں کے پردے میں تعمیر گلستاں ہوتے ہیں
بیدار عزائم ہوتے ہیں، اَسرار نمایاں ہوتے ہیں
جتنے وہ ستم فرماتے ہیں سب عشق پہ احساں ہوتے ہیں
یہ خون جو ہے مظلوموں کا ضائع تو نہ جائے گا، لیکن
کتنے وہ مبارک قطرے ہیں جو صَرفِ بہاراں ہوتے ہیں

اور۔

جو حق کی خاطر جیتے ہیں مرنے سے کہیں ڈرتے ہیں جگر
جب وقتِ شہادت آتا ہے دل سینوں میں رقصاں ہوتے ہیں!

اور دوسرے جناب رئیس امروہوی کا ایک قطعہ بھی جو روزنامہ جنگ میں شائع ہوا تھا تھوڑے سے تصرف کے ساتھ شائع کیا :۔

وہ وقت آیا کہ ہم کو قدرت ہماری سعی و عمل کا پھل دے
بتا رہی ہے یہ ظلمتِ شب کہ صبح نزدیک آ رہی ہے'
ابھی ہیں کچھ امتحان باقی' فلاکتوں کے نشان باقی
قدم نہ پیچھے ہٹیں کہ قسمت ابھی ہمیں آزما رہی ہے!
سیاہیوں سے حزیں نہ ہونا' غموں سے اندوہگیں نہ ہونا
انہی کے پردے میں زندگی کی نئی سحر جگمگا رہی ہے
رئیس اہلِ نظر سے کہہ دو کہ آزمائش سے جی نہ ہاریں
جسے سمجھتے ہو آزمائش وہی تو بگڑی بنا رہی ہے!

اس کے آخری شعر کو میں نے "رَئیس" کی زیر کے ساتھ شائع کیا۔ گویا مصرعہ یوں بن گیا کہ ؎ "رئیسِ اہلِ نظر سے کہہ دو کہ آزمائش سے جی نہ ہاریں!" اور اس طرح یہ تحریک کے ایک ادنیٰ کارکن کی جانب سے پیغام بن گیا تحریکِ اسلامی کے قائد و رئیس کے نام!!

بہرحال خدا خدا کر کے رنج و غم کے یہ بادل چھٹے' مولانا کی سزا میں تخفیف ہوئی اور اگرچہ طویل اسیری کی جدائی کا خیال سوہان روح تھا تاہم یہ اطمینان ہو گیا کہ — یار زندہ صحبت باقی!

دوسری جانب ۵۳ء ہی میں پاکستان کے طول و عرض میں سوشلسٹ نظریات اور بائیں بازو کے رجحانات کے حامل طلباء نے سر اٹھایا اور ایک ملک گیر تحریک شروع کر دی جس کا عنوان تھا: "طلباء کے مسائل اور مشکلات"۔ اس تحریک کا اصل مرکز کراچی تھا اور وہاں ان عناصر نے تقریباً تمام کالجوں کی یونینوں پر قبضہ کر کے ایک "بین الکلیاتی ادارہ" INTERCOLLEGIATE BODY کے نام سے قائم کیا جس کا مخفف I.C.B تھا اور طلباء کے مسائل اور مشکلات کے حوالے سے بھرپور ایجی ٹیشن شروع کر دیا۔ اُس وقت کی کراچی جمعیت کی قیادت نے اس صورت حال سے بایں طور

عہدہ بر آ ہونے کی سعی کی کہ اپنے پرچے "اسٹوڈنٹس وائس" (STUDENTS' VOICE) کو طلباء کے مسائل کا سب سے بڑا علمبردار (CHAMPION) بنادیا جس نے گویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔ لیکن جب ایجی ٹیشن کی آگ پوری طرح بھڑکی تو معلوم ہوا کہ اس کی قیادت میں جمیعت کا کوئی حصہ نہیں ہے — بلکہ قیادت کُل کی کُل I.C.B کے ہاتھ میں ہے —— میں لاہور میں بیٹھا اس صورتِ حال کو سخت پریشانی اور اضطراب کے ساتھ دیکھ رہا تھا۔ لیکن چونکہ جمیعت کے وسائل ان دنوں بہت محدود تھے اور ہوائی سفر تو بالکل ہی خارج از بحث تھا' لہٰذا اس کے باوجود کہ ناظمِ اعلیٰ مَیں تھا اور میرے نزدیک جمیعت کراچی کی یہ روش سخت غلط تھی تاہم میں بالکل اثر انداز ہونے کی پوزیشن میں نہ تھا— ان دنوں میں بارہا مولانا کی خدمت میں خاص اس مسئلے میں رہنمائی حاصل کرنے کے لئے حاضر ہوا۔ تو اگرچہ وہ خود اپنے معاملات اور اینٹی قادیانی تحریک سے پیدا شدہ مسائل میں بہت الجھے ہوئے تھے تاہم میری باتیں پوری توجّہ اور غور سے سنتے اور میرے ساتھ اتفاقِ رائے کا اظہار فرماتے' لیکن ایک تو خود اپنی مصروفیات اور پریشانیوں کے باعث اور دوسرے اس بنا پر کہ جمیعت قانوناً جماعت کے تابع نہ تھی اس ضمن میں اثر انداز ہونے سے معذوری کا اظہار فرماتے۔

تاہم جب کراچی کے قائدین کراچی میں اپنی فتح کے جھنڈے لہراتے عازمِ پنجاب ہوئے تو میں نے آگے بڑھ کر ملتان ہی میں ان کا بھرپور "خیر مقدم" کیا۔ اور پھر لاہور' لائلپور (حال فیصل آباد) اور راولپنڈی ہر جگہ ان کا پیچھا کرکے ان کی مہم کو بالکل ناکام بنا دیا۔ اگرچہ لاہور کے بعض طلباء کی جانب سے مجھے قتل کی دھمکیاں بھی موصول ہوئیں اور خود جمیعتِ لاہور کے بعض عناصر بھی میرے اس طرزِ عمل کے مخالف رہے' لیکن الحمدللہ کہ مولانا مودودی نے میرے اس طرزِ عمل سے پورا اتفاق فرمایا' اس پر ہر طرح صاد کیا' اور وہ میری ہر طرح سے ہمت افزائی فرماتے رہے' تا آنکہ وہ خود اس مخمصے میں گرفتار ہو گئے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔

تاہم اس مسئلے پر میرے اور کراچی جمیعت کی اُس وقت کی قیادت کے درمیان

شدید اختلافِ رائے پیدا ہو گیا جس میں بعد میں بعض دوسری چیزیں بھی شامل ہو گئیں اور خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی۔ نتیجتاً میں نے دورانِ سال ہی جمعیت کی نظامتِ علیا کی ذمہ داری سے علیحدگی اختیار کرلی اور آئندہ سالانہ اجتماع تک کے لئے ایک "قائم مقام ناظمِ اعلیٰ" کا تقرر کردیا۔ اور آئندہ سالانہ اجتماع کے موقع پر جو نومبر ۵۴ء میں کراچی میں منعقد ہوا' جہانگیر پارک میں منعقدہ ایک جلسۂ عام میں زیر صدارت ڈاکٹر عمر حیات ملک مرحوم ایک مفصل تقریر (جو ایک گھنٹہ چالیس منٹ پر پھیلی ہوئی تھی) "طلباء کے مسائل اور ان کے حل" ہی کے موضوع پر کی جس میں اپنے نقطۂ نظر کو پوری وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔

اس تقریر کے بارے میں جو انتہائی تحسین آمیز جملے ڈاکٹر عمر حیات ملک نے کہے وہ برادرم ظفر اسحٰق انصاری نے "اسٹوڈنٹس وائس" میں شائع شدہ رپورٹ میں درج کردیئے تھے ــــ لیکن میرے لئے سب سے بڑھ کر مسرت بخش اور حوصلہ افزا واقعہ یہ تھا کہ جیسے ہی میں تقریر ختم کرکے ڈائس سے نیچے اترا ایک عمر رسیدہ سفید ریش بزرگ نے دوڑ کر مجھے گلے لگالیا اور فرمایا : "جتنی دیر تم وہاں کھڑے تقریر کرتے رہے میں وہاں تمہاری بجائے مولانا مودودی کو دیکھتا رہا!" کافی دیر تک اپنے سینے سے چمٹائے رکھنے کے بعد جب انہوں نے مجھے علیحدہ ہونے کی اجازت دی تو میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے جن سے ان کی داڑھی بھیگ گئی تھی۔ ان آنسوؤں میں غالباً مولانا مودودی کی اسیری کا غم بھی شامل تھا اور اس بات کی خوشی بھی کہ جو شمع انہوں نے روشن کی ہے اس کی روشنی میں قدم آگے بڑھانے والے بہت سے نوجوان پیدا ہو گئے ہیں۔ یعنی۔

گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں
یہاں اب مرے راز داں اور بھی ہیں!

باب سوم

'یادِ یارِ مہرباں آید ہمے'

(۲۲ ستمبر ۹۲ء کا تحریر کردہ مضمون جو اکتوبر ۹۲ء کے "میثاق" میں شائع ہوا)

آج ۲۲ر ستمبر ۱۹۹۲ء ہے۔ گویا مولانا مودودی مرحوم کو اس جہانِ فانی سے دارالخلد منتقل ہوئے پورے تیرہ برس بیت چکے ہیں۔

میں نے ان کے انتقال کے لگ بھگ تین برس بعد اپنے پہلے سفرِ امریکہ کے موقع پر مولانا سے ملاقات کی شدید خواہش' لیکن ان کے اچانک انتقال کے باعث ۲۴ر ستمبر ۷۹ء کو بفلو میں ڈاکٹر احمد فاروق مودودی کے مکان پر مولانا کے صرف جسدِ خاکی کی زیارت اور نمازِ جنازہ میں شرکت کی ایک تأثراتی روداد تحریر کی تھی جو ستمبر ۸۲ء کے "میثاق" میں شائع ہوگئی تھی۔ اس کے بعد۔ " تازہ خواہی داشتن گر داغ ہائے سینہ را۔ گاہے گاہے باز خواں ایں قصۂ پارینہ را!" کے مصداق مولانا کے ساتھ اپنے ذاتی ربط و تعلق کی داستان لکھنی شروع کی تھی جس کی قسطِ اول میں ۴۶-۱۹۴۵ء سے ۵۳ء تک کے حالات و واقعات کا اجمالی خاکہ آگیا تھا۔ یہ قسط بھی اکتوبر ۸۲ء کے شمارے میں شائع ہوگئی تھی۔ لیکن اس کے بعد قلم پر سخت گرہ لگ گئی جو پورے دس سال لگی رہی۔

چند روز قبل ماہ ستمبر کی مناسبت سے ع۔ " یادِ یارِ مہرباں آید ہے!" کے مطابق پھر کچھ "داغ ہائے سینہ" تازہ ہوگئے اور ارادہ ہوا کہ اس "آخر" اور "اول" کے مابین خلا کو' خواہ اختصار کے ساتھ ہی سہی' کسی طور پاٹ دیا جائے۔ تو پہلے تو خوف سا محسوس ہوا کہ ۵۳ء سے ۷۹ء تک چھبیس (۲۶) برس پر پھیلی ہوئی داستان' اور

وہ بھی اب جبکہ اس کے خاتمے کو بھی تیرہ برس بیت چکے' کیسے لکھی جاسکتی ہے۔ لیکن پھر ایکا ایکی تو یہ خیال آیا کہ اب سے چار سال قبل مولانا مرحوم کے ساتھ اپنے ذہنی اور قلبی تعلق کے نشیب و فراز کا ایک مختصر خاکہ قلم سے "صادر" ہو کر میثاق ستمبر ۸۸ء میں شائع ہوگیا تھا۔ اب اگر اسے سامنے رکھ کر اس میں کچھ معیّن واقعات کا رنگ بھر دیا جائے تو کام زیادہ مشکل نہیں ہوگا۔ اور دوسرے دو روز قبل جب ہفت روزہ "تکبیر" کراچی کا شمارہ مورخہ ۲۴/ ستمبر ۹۲ء اور اس سے قبل کا شمارہ (مورخہ ۱۷/ ستمبر ۹۲ء) نظر سے گذرا تو احساس ہوا کہ ع" ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا!" کے مصداق یہ تاخیر بھی حکمت و مشیّتِ خداوندی سے ہوئی ہے! اور غالباً اس داستان کی تکمیل کا موزوں ترین وقت یہی ہے۔ چنانچہ اللہ کے بھروسے پر قلم ہاتھ میں لے لیا ہے۔ السّعی منّی والاِتمام من اللہ!

اب سب سے پہلے مناسب ہے کہ ۸۸ء کا تحریر کردہ متذکرہ بالا خاکہ (شائع شدہ میثاق ستمبر ۸۸ء) سامنے آجائے۔ اس کا واقعاتی پس منظر یہ ہے کہ میں وسط اکتوبر ۷۰ء تا وسط فروری ۷۱ء پاکستان سے باہر رہا تھا۔ یہ عام حساب سے چار ماہ بنتے ہیں' اور تبلیغی بھائیوں کے حساب سے "تین چلّے"۔ ان میں پورا ماہ رمضان المبارک بھی شامل تھا جو میں نے مدینۂ منوّرہ میں بسر کیا تھا۔ بعد ازاں ایک ماہ کے لئے برادر عزیز ابصار احمد کی دعوت پر انگلستان چلا گیا تھا۔ وہ ریڈنگ یونیورسٹی سے 'ایم فل' کرنے کے بعد اُن دنوں لندن یونیورسٹی میں 'پی ایچ ڈی' کی تکمیل کررہے تھے۔ وہاں سے پھر واپسی حجازِ مقدّس ہی ہوئی' جہاں حج کی سعادت حاصل کی۔ ذیل کا اقتباس لندن سے حجاز واپسی کے ذکر سے شروع ہوتا ہے:

> "واپس سعودی عرب پہنچا تو یہ غالباً جنوری ۷۱ء کی اٹھارہ تاریخ تھی اور اتفاقاً جدّہ ہی میں راؤ محمد اختر صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ ان سے مدینۂ منورہ کی عید الفطر کے دن والی ملاقات کے بعد پہلی بار ملنا ہوا تھا۔ پاکستان

کے عام انتخابات کے نتائج کی بنا پر وہ نہایت پژمردہ اور مضمحل تھے' میں نے لوہا گرم سمجھ کر کہا: "راؤ صاحب! کیا اب بھی آپ لوگ اپنے اندازوں اور طریق کار پر نظرثانی کرنے پر آمادہ نہیں ہوں گے؟" ـــــ تو میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب انہوں نے تڑخ کر جواب دیا: "ڈاکٹر صاحب! اب تو اگر خود مولانا مودودی بھی طریق کار کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں گے' تو ہم انہیں بھی ایسا ہرگز نہیں کرنے دیں گے!" ـــــ مجھے اُس وقت تو ان کی بات ایک "جذباتی طوفان" (EMOTIONAL OUTBURST) کا مظہر نظر آئی لیکن بعد میں اندازہ ہوا کہ یہ فی الواقع جماعت کے کارکنوں کی ایک بہت بڑی تعداد کے ذہن اور مزاج کی صحیح عکاسی تھی!۔

مکہ مکرمہ حاضر ہو کر عمرہ ادا کیا ـــــ تو وہاں برادرم زبیر عمر صدیقی سے ملاقات ہوئی' انہوں نے بتایا کہ ان کے پاس مولانا مودودی کی اُس تقریر کا ٹیپ پہنچ گیا ہے جو انہوں نے لاہور کے ایک اجتماعِ کارکنان میں انتخابات میں جماعت کی بری طرح ناکامی پر جماعت ہی کے حلقے کے بعض صحافیوں کی نکتہ چینیوں کے جواب میں کی تھی۔ (واضح رہے کہ یہ وہی صحافی تھے جو انتخابات سے قبل جماعت اسلامی کی شاندار متوقع کامیابی کے ضمن میں مبالغہ آمیز اندازے شائع کرتے رہے تھے' لیکن اب جبکہ نتیجہ برعکس نکل آیا تھا تو جماعت کی بعض حکمت عملیوں اور بالخصوص طریقِ تنظیم کو ہدفِ تنقید بنا رہے تھے!)۔ چنانچہ میں نے ان کے مکان پر حاضر ہو کر اس تقریر کا ریکارڈ سنا تو مجھے بالکل ایسے محسوس ہوا کہ جیسے مولانا کسی جیوری کے سامنے ایک ملزم کی حیثیت سے پیش ہو کر صفائی پیش فرما رہے ہوں۔ چنانچہ اس پر میں اپنے جذبات کو قابو میں نہ رکھ سکا اور میری آنکھوں میں بے اختیار آنسو آ گئے ـــــ کہ اللہ اکبر کس قدر دردناک اور حسرتناک معاملہ ہے کہ ایک ایسا شخص جس نے پوری زندگی دعوت و خدمتِ دین اور اعلاء کلمۃ اللہ اور اقامتِ دین کی جدوجہد میں صَرف کر دی' اور علامہ اقبال کے اس شعر کے مصداق کہ ۔

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو
لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمر قند!

بلامبالغہ لاکھوں انسانوں کو متأثر کیا--- اور ہزاروں کی زندگیوں میں انقلاب برپا کر کے انہیں غلبۂ دین کی جدّوجُہد کا سپاہی بنادیا' عمر کے آخری حصے میں اپنے ہی عقیدت مندوں کے حلقے سے تعلق رکھنے والے---- اور اپنے بیٹوں کی عمر کے نوخیز و نومشق صحافیوں کے سامنے اپنے بعض اساسی نظریات' بالخصوص ہیئتِ تنظیمی کا دفاع کرنے پر مجبور ہوگیا ہے---- **فَاعْتَبِرُوا يَا أُولِي الْأَبْصَارِ!**

بہرحال اواخر جنوری ۷۷ء کی کسی تاریخ کو مکہ مکرمہ میں زبیر عمر صدیقی صاحب کے مکان پر جو چند آنسو میری آنکھوں میں بے اختیار امڈ آئے تھے انہوں نے میرے دل کے اس غبار کو دھو ڈالا جو ۱۹۴۲ء کے بعد سے مولانا مودودی کے ساتھ کدورت کی بنا پر جمع ہونا شروع ہوگیا تھا۔

تفصیل اِس اِجمال کی یہ ہے---- کہ مولانا مودودی مرحوم کے ساتھ میرا تعلّق اتار چڑھاؤ کے متعدّد ادوار سے گزرا ہے' اور ان کے بارے میں میرے احساسات اور قلبی کیفیات میں کئی بار تغیر و تبدّل ہوا ہے۔ چنانچہ:

۱۔ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک یعنی پندرہ سے اکیس برس عمر کے دوران انکے ساتھ میرا تعلق غایت درجہ محبت اور احترام ہی کا نہیں' انتہائی عقیدت کا بھی تھا۔ اور میں اپنے چھوٹے سے ذہن اور محدود معلومات کی بناپر انہیں نبیِّ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین رضی اللہ عنہم کے بعد امتِ مسلمہ کا عظیم ترین فرد سمجھتا رہا۔

۲۔ ۱۹۵۳ء میں پہلی بار اِدھر لاہور اور پنجاب میں تحریکِ ختم نبوت کے ضمن میں جماعت اسلامی کے رول اور اُدھر کراچی میں طلبہ کی کمیونسٹ تحریک کے ضمن میں اسلامی جمعیت طلبہ کے رول سے میرے ذہن میں اولین شکوک و شبہات نے جنم لیا۔ اور جماعت کی پالیسی کے بارے میں

اس اختلافی سوچ کا آغاز ہوا جو ۵۶-۵۵ء تک اپنے نقطۂ عروج تک پہنچ گئی اور نومبر۵۶ء میں اُس اختلافی بیان کی صورت میں ضبطِ تحریر میں بھی آگئی جو پورے دس سال بعد (۱۹۶۶ء میں) " تحریک جماعت اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ " کے نام سے شائع ہوا ـــــ اس عرصے کے دوران رفتہ رفتہ عقیدت کا تو خاتمہ ہوگیا' تاہم محبت اور احسان مندی کا جذبہ برقرار رہا۔

۳۔ ۵۶ء سے اپریل ۵۷ء تک مولانا مرحوم کے بعض اقدامات کی بنا پر ان کے ساتھ حسنِ ظن کو شدید صدمہ پہنچا ـــــ لیکن اس کے باوجود ایک گونہ دلی تعلق بھی برقرار رہا ـــــ اور احسان مندی کے جذبات میں بھی کوئی کمی نہیں آئی ـــــ اور اپریل ۵۷ء میں جماعت سے علیحدگی کے بعد سے اپریل ۷۲ء تک یہ کیفیت علیٰ حالہٖ برقرار رہی ۔ چنانچہ ابتداء میں تو میں ملاقات کے لئے بھی حاضر ہوتا رہا اور اگرچہ یہ محسوس کرکے کہ مولانا بھی میری آمد سے کچھ زیادہ خوش نہیں ہوتے اور ۵۔ اے ذیلدار پارک کی عمومی فضا میں تو بہت ہی ناگواری پائی جاتی ہے' یہاں تک کہ بعض لوگوں کے چہرے تو ہو بہو " تَعرِفُ فِی وُجُوهِهِمُ المُنکَر " کا منظر پیش کرنے لگتے ہیں' میں نے آمد و رفت تو بند کردی ـــــ تاہم مولانا سے کوئی قلبی بُعد پیدا نہیں ہوا اور احسان مندی کے جذبات تو جوں کے توں قائم رہے ـــــ چنانچہ اپریل ۷۲ء میں حج کے لئے روانگی سے قبل میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا اور میں نے عرض کیا کہ: " مولانا! میں حج کے لئے جارہا ہوں۔ آپ کی خدمت میں یہ عرض کرنے آیا ہوں کہ اگرچہ جماعت کی پالیسی سے میرا اختلاف نہ صرف علیٰ حالہٖ قائم ہے بلکہ شدید تر ہوگیا ہے ـــــ لیکن میرے دل میں آپ کی جانب سے کوئی کدورت نہیں ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اگر آپ کے دل میں میری جانب سے کوئی مَیل ہو تو آپ بھی اسے صاف فرمالیں!" ـــــ اس پر مولانا نے بڑے اطمینان اور انشراح کے ساتھ فرمایا: " آپ بالکل مطمئن رہیں' میرے دل میں آپ کی جانب سے ہرگز کوئی میل نہیں ہے!" ـــــ یہی وجہ ہے کہ جب میری روانگی کے بعد دفعۃً مولانا کو

سعودی حکومت کی جانب سے "رابطۂ عالمِ اسلامی" کے تاسیسی اجلاس میں شرکت کا دعوت نامہ ملا اور چند روز بعد وہ بھی حجازِ مقدس پہنچ گئے تو میں نے ان سے متعدد بار مکہ مکرمہ میں فُندق مصر میں ملاقات بھی کی اور جماعت کی پالیسی کے بارے میں کچھ گفتگو بھی کرنی چاہی۔ اگرچہ اس کا جواب مجھے بہت حوصلہ شکن ملا۔

۴۔ ۱۹۶۴ء سے ۱۹۷۰ء تک کا عرصہ اس داستان کا تاریک ترین باب ہے۔ اس زمانے میں جماعت اسلامی نے ایک جانب جمہوریت کے عشق میں جس انتہا پسندی کا ثبوت دیا کہ نہ صرف یہ کہ خالص سیکولر بلکہ ملحد عناصر کے ساتھ گٹھ جوڑ میں بھی کوئی باک محسوس نہ کی' اور مبالغہ آرائی اس حد تک پہنچ گئی کہ صدر ایوب خان بمقابلہ محترمہ فاطمہ جناح کے باب میں یہ الفاظ تک کہہ دیئے گئے کہ: "ایک جانب ایک مرد ہے جس میں اس کے سوا کوئی خوبی نہیں کہ وہ مرد ہے' اور دوسری جانب ایک عورت ہے جس میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ وہ عورت ہے!" —— اور دوسری طرف عوامی توجہ کا مرکز بننے کے لئے دینی اعتبار سے اس درجہ پستی اختیار کر لی گئی کہ "غِلافِ کعبہ کی رام لیلا" منعقد کرنے میں بھی کوئی حجاب محسوس نہ کیا—— وغیرذالک —— تو' مجھے اس کے اعتراف میں کوئی باک نہیں کہ' میرے دل میں محبت کی جگہ نفرت نے لے لی۔ یہاں تک کہ احسان مندی کے جذبات بھی اس منفی جذبے کے نیچے دب کر رہ گئے—— یہی سبب ہے کہ میری ۱۹۶۶ء تا ۱۹۷۰ء کی تحریروں میں تلخی کا رنگ بہت نمایاں ہے!

۵۔ اور یہی وہ کیفیت تھی جس میں ایک اچانک انقلاب اواخرِ جنوری ۱۹۷۱ء کی اُس شام کو مکہ مکرمہ میں آیا' جس کا تذکرہ پہلے ہوچکا ہے اور جس کے نتیجے میں نفرت کی جگہ تأسف آمیز حسرت نے لے لی' اور اگرچہ اختلاف پوری شدت کے ساتھ قائم رہا—— تاہم قلب کی گہرائیوں سے ذاتی احسان مندی کا جذبہ دوبارہ ابھر آیا جو بحمدِ اللہ آج تک برقرار ہے!

۶۔ لیکن اس کے بعد بھی مولانا سے ملاقات کی نوبت نہیں آسکی۔ اس لئے کہ ایک تو اس طویل عرصے کے دوران بہت سے اسباب کی بناء پر' اور بالخصوص میری اپنی بعض تحریروں کے باعث حجابات بہت گہرے ہوچکے تھے ـــــ دوسرے پالیسی کا اختلاف جوں کا توں برقرار تھا ـــــ اور یہ بات میرے علم میں بہت دیر کے بعد آئی کہ ۱۹۷۰ء کی انتخابی شکست کے بعد مولانا اپنی بعد از تقسیمِ ہند پالیسی سے مایوس ہوگئے تھے اور تہہ دل سے چاہتے تھے کہ اسے تبدیل کردیا جائے۔ لیکن اب کچھ اپنی ضعیفی اور علالت' اور کچھ جماعت کے کارکنوں' اور بالخصوص اس کی نئی قیادت کے مزاج میں سیاسی رنگ کے پختہ ہوجانے کے باعث وہ بالکل بے بس ہو کر رہ گئے تھے ـــــ بہرحال' جب میرے علم میں یہ حقائق آئے تو فطری طور پر دل میں ملاقات کی ایک شدید خواہش پیدا ہوئی لیکن جن ذرائع سے مولانا کے نقطۂ نظر کی تبدیلی کا علم حاصل ہوا تھا ان ہی کے ذریعے یہ بھی معلوم ہوا کہ اب ان کے گرد جماعت کا حفاظتی حصار بہت سخت ہے' اور اول تو ان سے میری ملاقات ہی محال کی حد تک مشکل ہے' ثانیاً اس کی توقع بہت کم ہے کہ مولانا کھل کر بات کرسکیں۔ لہٰذا اس "سعیِ لا حاصل" کا ارادہ ترک کردیا۔

۷۔ ۱۹۷۹ء کے ماہ اگست میں امریکہ سے ایک زوردار دعوت موصول ہوئی اور میں نے اسے قبول کرلیا تو اس خیال کے تحت کہ مولانا بھی آج کل وہیں مقیم ہیں دل میں دبی ہوئی خواہش کی چنگاری بھڑک اٹھی اور پختہ ارادہ کرلیا کہ وہاں ملاقات ضرور کروں گا ـــــ لیکن افسوس کہ جیسے ہی میں امریکہ پہنچا' مولانا شدید علیل ہوگئے' اور شدید خواہش کے باوجود ان سے زندگی میں ملاقات نہ ہوسکی۔ بلکہ صرف ان کے مردہ جسدِ خاکی کی زیارت اور نمازِ جنازہ میں شرکت نصیب ہوسکی ـــــ اور اس موقع پر مولانا کے صاحب زادے ڈاکٹر احمد فاروق کے اِس جملے نے میری حسرت کو دو چند کردیا کہ "اباجان بھی آپ سے ملاقات کے بہت خواہش مند تھے' لیکن ان کے

معالجین کی سخت ہدایت تھی کہ ان سے انتہائی قریبی رشتہ داروں کے سوا
اور کوئی نہ ملنے پائے!"

اِس خاکے کی شِق نمبرے کی تفصیل میری سولہ صفحات سے زائد پر پھیلی ہوئی اس تحریر میں موجود ہے جو ستمبر ۸۲ء کے "میثاق" میں شائع ہوئی تھی 'اور شق نمبرا کی بیس صفحات سے زائد پر مشتمل تفصیل اکتوبر ۸۲ء کے میثاق میں شائع ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اب جس خلا کو پر کرنا مطلوب ہے اس کے لئے اوپر اوّل اور آخر کی بجائے آخر اور اوّل کے درمیان کے خلا کے الفاظ استعمال ہوئے۔ اب ذیل میں درمیان کی پانچ شِقوں کے ضمن میں یہ سلسلہ وار گذارشات پیش ہیں۔

شِق نمبر۲ کے ضمن میں جہاں تک ۵۳ء کی ختمِ نبوت تحریک میں جماعت اسلامی کے رول کا تعلق ہے اُس وقت میں نے یہ تو ضرور محسوس کرلیا تھا کہ وہ جماعت کے سابق اصولی موقف سے مطابقت نہیں رکھتا اور صرف وقتی سیاسی دباؤ کا نتیجہ ہے لیکن اس وقت تک میرا تجزیہ اس سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ مزید برآں میں اُس وقت جماعت کے اندرونی حالات سے بھی قطعاً واقفیت نہیں رکھتا تھا' اس لئے کہ میں پورے پانچ سال سے کلّیۃً اسلامی جمعیت طلبہ ہی کے حلقے میں مصروف و مشغول تھا۔ یہ راز کہ جماعت اسلامی کے اخلاقی زوال کا آغاز ہوچکا ہے مجھ پر دو سال بعد ۵۵ء میں کھلا جب میں جماعت اسلامی کا رُکن بن کر جماعت کے حلقہ اوکاڑہ کے نظم سے وابستہ ہوا۔ البتہ جہاں تک اسلامی جمعیت طلبہ کی کراچی کی قیادت کا تعلق ہے اس کے ضمن میں مجھے اُسی وقت شدید تشویش لاحق ہوگئی تھی۔ اور اس کے جس کردار اور رویّہ کا مظاہرہ میرے علم میں ۵۳ء کے جمعیت کے سالانہ اجتماع کے موقع پر آیا تھا شاید اس کی وضاحت اور صراحت کے لئے اللہ تعالیٰ نے آج ہی کا وقت طے کیا ہوا تھا اور اسی لئے آج سے دس سال قبل میرے قلم پر گرہ لگادی تھی جو اب کھلی ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا ہوں کہ اکتوبر ۸۲ء کے "میثاق"

میں شائع ہونے والی قسطِ دوم ٹھیک اسی مقام پر آکر ختم ہوئی تھی کہ ۵۳ء میں جمعیت کے سالانہ اجتماع منعقدہ کراچی کے جلسۂ عام کا ذکر تو ہوگیا تھا لیکن تنظیمی امور بیان نہیں ہوئے تھے۔

اس لئے کہ ہفت روزہ تکبیر کی ۱۷ر اور ۲۴ر ستمبر ۹۲ء کی اشاعتوں میں میاں طفیل محمد' جناب نعیم صدّیقی' اور چودھری نذیر احمد کی تحریروں سے جماعت کے موجودہ خلفشار کی جو تصویر سامنے آتی ہے اور جماعت کے قدیم ترین "السابقون الاولون" کے "بقیۃ الزّمان" اور مولانا مودودی مرحوم کے قریب ترین ساتھیوں کا جو حال نظر آتا ہے کہ وہ ع "میری دنیا لٹ رہی تھی اور میں خاموش تھا!" سے گزر کر "دشنام' نالہ' ہاو ہو' فریاد کچھ تو ہو۔ چیخے ہے درد اے دلِ برباد کچھ تو ہو" کی روش اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے ہیں' یہ سب ایک "قبضہ گروپ" کی کارستانیوں کا مظہر ہے جو جماعت کی قیادت پر قابض ہوگیا ہے ـــــ اور اس گروپ کا آغاز اسلامی جمعیت طلبہ کراچی کی ۵۳-۵۲ء کی "قیادت" کی صورت میں ہوا تھا!

تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ ۵۳ء کے اوائل میں جب میں جمعیت کا ناظم اعلیٰ تھا میں جماعت اسلامی کی مرکزی شوریٰ کے ایک اجلاس کے موقع پر اپنے لاہور جمعیت کے چند ساتھیوں کی معیت میں جماعت کے مرکز واقع ۵-اے' ذیلدار پارک' اچھرہ میں جماعت کے اکابر سے ملاقات کی غرض سے حاضر ہوا تھا تو اس موقع پر چوہدری غلام محمد مرحوم (امیر جماعت اسلامی حلقۂ سندھ) اور شیخ سلطان احمد صاحب نے مجھ سے یہ شکایت کی تھی کہ "کراچی کی جمعیت کے قائدین ہم سے تو دُور دُور رہتے ہیں لیکن مولانا ظفر احمد انصاری (جو اب فوت ہو چکے ہیں' اللہ ان کی مغفرت فرمائے!) سے بہت گھلے ملے رہتے ہیں اور ساری رہنمائی اور مشورے ان ہی سے حاصل

کرتے ہیں۔ مزید بر آں ان پر اخوان کے بعض قائدین بالخصوص ڈاکٹر سعید رمضان صاحب کا رنگ بہت چڑھتا جا رہا ہے!"

اس سے قبل میں اور جمعیت لاہور کے بعض دوسرے ساتھی خود بھی یہ محسوس کر چکے تھے کہ ایک تو کراچی جمعیت کے بعض نمایاں رفقاء محبت اور اخوت کے جذبات کے اظہار میں اس حد تک مبالغہ کرتے ہیں کہ "تصنّع" تک کی بو آنے لگتی ہے' اور دوسرے وہ آپس میں ایک مضبوط گروپ یا جتھے کے مانند مربوط اور منظم ہیں' اور اپنے پہلے سے طے شدہ فیصلوں اور منصوبوں کو کھسر پھسر اور سرگوشیوں کے ذریعے منوا لینے کے فن میں ماہر اور مشّاق ہیں' لیکن ہم نے اسے اُس وقت تک صرف پنجاب اور کراچی کی "آب وہوا" اور پنجابی اور "ہندوستانی" مزاج کے فرق وتفاوت پر محمول کیا تھا ——— متذکرہ بالا دو بزرگوں کی شکایت سے اندازہ ہوا کہ ہمارے اس مشاہدے کا جزوِ اول ان حضرات کے عرب رہنماؤں سے میل جول کا مظہر ہے' اس لئے کہ ملاقات کے موقع پر غیر معمولی گرم جوشی کا اظہار عربوں کا خصوصی وصف ہے' اور جزوِ ثانی مولانا ظفر احمد انصاری کی بالواسطہ "قیادت" کا۔ اس لئے کہ مولانا انصاری خیالات ونظریات کے اعتبار سے خالص ومخلص' اور کٹر مسلم لیگی' مزاج کے اعتبار سے صد فی صد "عملی" اور خالص سیاسی' اور گفتگو اور مذاکرات کے فن کے بے پناہ ماہر تھے! (یہی وجہ ہے کہ مولانا امین احسن اصلاحی نے انہیں "مذاکرات کا بادشاہ" قرار دیا تھا!) لہٰذا انہوں نے کراچی جمعیت کو مولانا مودودی مرحوم کی خالص اصولی اور نظریاتی نہج سے ہٹا کر "عملی سیاست" کے رخ پر ڈال دیا۔ اور اسی کا مظہر جمعیت کراچی اور بالخصوص اس کے آرگن "اسٹوڈنٹس وائس" (STUDENTS' VOICE) کا طلبہ کے مسائل اور ان کے "حقوق" کی علمبرداری کا خالص سیاسی رول تھا جس کا ذکر میری اس سے قبل کی تحریر میں آچکا ہے ——— اور جس کے بارے میں مَیں یہ عرض کر چکا ہوں کہ اس سے مولانا مودودی مرحوم بھی سخت نالاں اور پریشان تھے!

کراچی جمعیت کی اصل قیادت اُس وقت تین اشخاص پر مشتمل تھی۔ اس کے سرخیل اور ماسٹر مائنڈ خورشید احمد صاحب تھے' (جو اب سینیٹر پروفیسر خورشید احمد ہیں!)۔ مذہبی درس و تدریس اور جذباتی تقریر کی اہلیت کے حامل ہونے کے اعتبار سے اس گروپ کے عمومی "ترجمان" (SPOKESMAN) کی حیثیت جناب خرم جاہ مراد کو حاصل تھی' (جن سے میری عزیزداری بھی ہے!) —— یہ دونوں حضرات اِس وقت جماعت اسلامی کے "نائب امراء" میں شامل اور بظاہر موجودہ امیرِ جماعت قاضی حسین احمد صاحب کے دست و بازو' لیکن اصلاً ان کے مشیر 'مربّی' اور سرپرست ہیں —— کراچی جمعیت کی اُس وقت کی قیادت کی "تثلیث" کی "اقنومِ ثالث" یا تیسری شخصیت مولانا ظفر احمد انصاری (مرحوم) کے پسرِ اکبر ظفر اسحٰق صاحب تھے (موجودہ ڈاکٹر ظفر اسحٰق انصاری' ڈائریکٹر ادارۂ تحقیقاتِ اسلامی اسلام آباد) جو ایک جانب فطری طور پر مولانا ظفر احمد انصاری اور اس گروپ کے مابین واسطہ کے فرائض باحسن وجوہ سرانجام دیتے تھے اور دوسری جانب "اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ" کے مصداق "سرگوشیوں" میں طاق و مشّاق ہونے کے اعتبار سے اس تثلیث میں "روح القدس" کی سی حیثیت رکھتے تھے!

جمعیت کے ۵۳ء کے سالانہ اجتماع کے موقع پر اس گروپ نے جمعیت کے مرکز کو لاہور سے کراچی منتقل کرانے اور خورشید صاحب کو ناظم اعلیٰ منتخب کرانے میں اپنی فنی مہارت کا جو مظاہرہ کیا اس کے سامنے میں اور رفقاء جمعیت لاہور بالکل اسی طرح بے بس ہو گئے تھے جس طرح آج میاں طفیل محمد اور جناب نعیم صدیقی قاضی حسین احمد صاحب کی "انتخابی مہم" کے سامنے بے بس ہو گئے ہیں۔ اور خود مجھے یہ تلخ حقیقت اس طرح برملا بیان کرنے کی ہمت اس لئے ہو گئی ہے کہ اب جماعت کے یہ اکابر اس کا اعلان ببانگِ دہل کر رہے ہیں کہ جماعت اسلامی میں جماعتی عہدیداروں کے انتخابات تک میں "دھاندلیاں" ہوتی ہیں' اور "کاروانِ دعوت" دراصل قاضی حسین احمد صاحب کی کنویسنگ کے قافلے کی حیثیت سے "جادہ پیما" ہونے والا ہے!

۵۳ء میں کراچی کی متذکرہ بالا تثلیث سے بھرپور تعاون "شمال" سے صرف ایک شخص نے کیا تھا یعنی سید مراد علی شاہ صاحب نے جو اگرچہ زیرِ تعلیم تو لاہور میں تھے لیکن تعلق سرحد سے رکھتے تھے (واضح رہے کہ یہ بھی سینیٹر بننے سے بال بال ہی بچے ہیں!) اور بعد میں جماعت اسلامی سرحد کے "رہنماؤں" میں شامل ہو گئے تھے۔ چنانچہ قاضی حسین احمد صاحب کا ان سے تعلق بالکل اسی نوعیت کا ہے جو کراچی کے سید منور حسن صاحب کا سینیٹر پروفیسر خورشید احمد سے!

اپنی ۸۲ء کی تحریر میں مَیں نے ۵۳ء کو پاکستان کی تحریکِ اسلامی کا "عام الحزن" قرار دیا تھا۔ یہ بات مجموعی طور پر تو درست تھی ہی' ذاتی طور پر میرے لئے "درست تر" تھی۔ میں اس "اسلامی جمعیت طلبہ پاکستان" کو جس کے لئے میں نے اپنے کیریئر کو داؤ پر لگا دیا تھا اور اپنی زندگی کے پورے پانچ سال نہایت تندہی کے ساتھ صَرف کئے تھے اپنی نگاہوں کے سامنے نظریاتی اور انقلابی راہ سے ہٹ کر خالص سیاسی ذہن رکھنے والے لوگوں کے "قبضے" میں جاتا دیکھ رہا تھا اور لاہور میں رہتے ہوئے بحیثیتِ ناظمِ اعلیٰ وسائل کی کمی کے باعث دُور دراز کی تنظیم یعنی ـــــ جمعیت کراچی پر اثرانداز ہونے اور نئے رجحانات کو روکنے سے قاصر تھا۔ اور اگرچہ لاہور اور پنجاب میں مَیں نے کراچی کی آئی سی بی کو شکست فاش دیدی تھی لیکن کراچی میں جمعیت کے "قبضہ گروپ" کی فنی مہارت سے مات کھا گیا تھا۔ چنانچہ اسی بددلی کے باعث جمعیت کی رکنیت سے فوری طور پر تو مستعفی ہوگیا تھا' تاہم کچھ ہی دنوں بعد میں نے کچھ بعض احباب کے سمجھانے سے' اور اصلاً اپنے اس احساس کی بنا پر کہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد فرضِ عین ہے' اور اس کے لئے جماعت کا التزام شرطِ لازم ہے' استعفاء واپس لے لیا تھا' اگرچہ تعلیمی سال ۵۴۔۵۳ء کے دوران میں نے کوئی ذمہ داری قبول نہیں کی۔ اور اکثروبیشتر تو صرف ایک عام کارکن کی حیثیت سے کام کیا۔ البتہ ۵۴ء کی تعطیلاتِ موسمِ گرما کے دوران ملتان میں منعقدہ ایک تربیت گاہ میں' جو غالباً پندرہ دن جاری رہی تھی' میں نے مولانا امین احسن اصلاحی سے ۵۱ء اور ۵۲ء کی

تربیت گاہوں میں حاصل شدہ قرآن کے دروس اور تزکیۂ نفس کے لیکچرز کو جس طرح "بیان" اور صحیح تر الفاظ میں "REPRODUCE" کیا اس کی ایک لذّت کا احساس خود مجھے بھی آج تک ہے اور اس کی ایک شہادت جناب نصراللہ شیخ صاحب نے، جو اُن دنوں جمعیت ملتان کی روحِ رواں تھے، خود مولانا اصلاحی کے سامنے ایک موقع پر ان الفاظ میں دی کہ "مولانا! آپ کے اپنے درس بھی ہم نے بہت بار سنے، اور تزکیۂ نفس پر اب آپ کی کتاب بھی طبع ہو گئی ہے، لیکن آپ کی یہ چیزیں جس طور سے اُس تربیت گاہ میں ہمیں ڈاکٹر اسرار نے پڑھائی تھیں اس جیسی نہ لذّت پھر کبھی حاصل ہوئی نہ UNDERSTANDING!"

قصّہ مختصر، ۵۴ء کے دوران مولانا مودودی جیل میں تھے۔ اور میری کیفیت جمعیت کے حالات کے مشاہدات کی بنا پر بالکل وہی تھی جو اب سے ایک سال قبل نعیم صدیقی صاحب کی نظم "بنامِ دلبر" میں سامنے آتی ہے، ـــــ البتہ اس پورے سال کے دوران چونکہ میں جمعیت میں زیادہ فعّال نہیں رہا، لہذا غور و فکر کے لئے وافر وقت ملتا رہا ـــــ اور میں کم از کم ذاتی اعتبار سے تو اس نتیجے تک پہنچ گیا کہ مولانا مودودی نے ۴۸ء میں ماہنامہ "ترجمان القرآن" میں (اتفاق سے وہ بھی ستمبر ہی کا شمارہ تھا!) پاکستان میں نظامِ اسلامی کے قیام کے جو دو ممکن طریقے بیان کئے تھے، ان میں سے جس طریقے پر ۴۷ء تا ۵۳ء عمل کیا ہے اس کا غیر مفید ہونا واضح ہو چکا ہے، اور اب دوبارہ اسی دوسرے طریقے پر عمل شروع کر دینا چاہئے جس پر جماعت قیامِ پاکستان سے قبل عمل پیرا تھی، لیکن یہ بس ایک "رائے" تھی جس پر کوئی عزم بالجزم مجھے اُس وقت تک حاصل نہیں ہوا تھا اور اپنی جگہ اس کا پوری طرح قائل ہونے کے باوجود میرا ذہن اس کے غلط ہونے کے امکان کو تسلیم کرنے کے لئے بھی پوری طرح آمادہ تھا!

بہرحال نومبر ۵۴ء میں ایم بی بی ایس کے فائنل امتحان سے فارغ ہو کر میں منٹگمری (حال ساہیوال) منتقل ہو گیا، اور ایک ہی تاریخ میں جمعیت طلبہ سے آخری

رخصتی استعفاء اور جماعت اسلامی کی رکنیت کی درخواست تحریر کر دی۔ اُن دنوں مولانا مودودی ملتان جیل میں نظربند تھے' اور یہ بھی نومبر ۵۴ء ہی کا واقعہ ہے کہ منٹگمری سے ایک وفد ان سے ملاقات کے لئے وہاں گیا تو میں بھی اس میں شریک تھا۔ جب ملاقات کا معین وقت ختم ہونے کے قریب ہوا تو میں نے چند منٹ کے تخلیئے کی اجازت طلب کی' اور باقی حضرات کے رخصت ہو جانے پر تنہائی میں مولانا سے سوال کیا کہ: "کیا آپ کے خیال میں ابھی وقت نہیں آیا کہ ہم موجودہ طریق کار کو ترک کر کے دوبارہ قبل از تقسیم ہی کے طریق کو اختیار کر لیں!" اس پر مولانا کا مختصر جواب تھا: "میں ابھی اِس راستے کے لئے دروازے بند نہیں پا رہا!" ظاہر ہے کہ اس پر زیادہ بحث و تمحیص کے لئے نہ تو وقت ہی دستیاب تھا' نہ میری حیثیت ہی ایسی تھی کہ مولانا سے لمبی بحث کر سکتا' نہ ہی ابھی خود میں اس رائے پر پوری طرح جازم ہوا تھا۔

لیکن ۵۵ء اور ۵۶ء کے دوران جب میں نے نہ صرف امیرِ جماعت اسلامی منٹگمری کی حیثیت سے زور شور کے ساتھ کام کیا' بلکہ حلقہ اوکاڑہ کی مجلسِ شوریٰ کے رکن' اور ایک عوامی مدرسِ قرآن کی حیثیت سے میرا پورے حلقے میں آنا جانا ہوا تو مجھے اندازہ ہوا کہ جماعت کے کارکنوں اور عہدیداروں کا اخلاقی معیار کم از کم اُس تصویر کے مقابلے میں بہت نیچے گر چکا ہے جو اس کے لٹریچر میں سامنے آتی ہے' اور اس طرح آٹھ نو سال کی سیاسی سرگرمی نے نہ صرف یہ کہ جماعت کی اصولی' انقلابی حیثیت کو تبدیل کر کے رکھ دیا ہے بلکہ ارکان اور کارکنوں کے اخلاقی معیار کو متأثر کر کے اس کی معنوی قوت اور اخلاقی ساکھ کو بھی شدید نقصان پہنچایا ہے۔ چنانچہ اب مجھے اپنی اس رائے پر زیادہ انشراح حاصل ہو گیا کہ ہمیں فی الفور قبل از قیامِ پاکستان کی پالیسی کی جانب رجوع کر لینا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ نومبر ۵۵ء میں جماعت کا جو سالانہ اجتماع کراچی میں منعقد ہوا اس میں مَیں نے جماعت کی پالیسی کے ضمن میں اظہارِ خیال کے لئے نوٹس ارسال کر دیا تھا۔

نومبر ۵۵ء کے سالانہ اجتماع سے لے کر فروری ۵۷ء کے اجتماعِ ارکان منعقدہ

ماچھی گوٹھ تک کی تلخ داستان میں اپنی تالیف "تاریخ جماعت اسلامی کا ایک گمشدہ باب" میں تحریر کر چکا ہوں' اور جماعت کی پالیسی کے بارے میں میری مفصّل رائے بھی' جو میں نے ایک بیان کی صورت میں نومبر ۵۶ء میں جائزہ کمیٹی کی خدمت میں پیش کی تھی' ۶۶ء میں "تحریکِ جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ" کے نام سے طبع ہو گئی تھی' لہٰذا "میرے مولانا مودودی مرحوم کے ساتھ ذاتی ربط و تعلق" کی اِس داستان میں متذکرہ بالا خاکے کی شق نمبر ۳ کے ضمن میں مزید کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ ۶۲ء کے حج کے موقع پر جو ملاقاتیں مولانا سے رہیں ان کی قدرے تفصیل بیان کر دی جائے!

مکہ مکرمہ میں مولانا فندق مصر میں مقیم تھے۔ اور میں کئی بار اُن سے ملنے وہاں گیا تو یہ دیکھ کر حیرت بھی ہوئی اور اپنی اُس وقت کی ذہنی و قلبی کیفیت کے اعتبار سے کسی قدر افسوس بھی ہوا کہ ہوٹل کے لاؤنج میں مولانا تو اکثر و بیشتر تنہا بیٹھے ہوتے تھے لیکن مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہٗ کے گرد ہر وقت ملاقاتیوں کا جمگھٹا رہتا تھا، جن میں اکثریت عربوں کی ہوتی تھی۔ اور اکثر یہ الفاظ سننے میں آتے رہتے تھے: **"أين الاستاذ الندوی؟"** جس سے اندازہ ہوا کہ اہلِ عرب اُس وقت تک مولانا سے زیادہ واقف نہیں تھے!

اسی سال "رابطۂ عالمِ اسلامی" کا تاسیسی اجلاس منعقد ہوا تھا اور پاکستان سے مولانا مودودی اور مولانا داؤد غزنوی اسی میں شرکت کے لئے وہاں بلائے گئے تھے۔ مولانا داؤد غزنوی کا مجھ پر یہ کرم ہوا کہ انہوں نے مجھے اپنا "سکرٹری" قرار دیدیا اور اس طرح میں بھی اُن مجالس میں باضابطہ شریک رہا۔ اُن دنوں کی چند باتیں جو حافظے میں محفوظ ہو گئیں عمومی دلچسپی کے پیش نظر درج ذیل ہیں:

۱۔ افتتاحی اجلاس میں پہلا خیر مقدمی خطاب مفتیِ اعظم سعودی عرب ابراہیم بن محمد کا تھا جو "آلِ شیخ" یعنی شیخ عبدالوہاب نجدی کی اولاد میں سے تھے' اور نابینا تھے۔ ان کا خطاب رسمی بھی تھا اور مختصر بھی۔ تاہم اس کے اختتام پر حاضرین نے تالیاں بجائیں تو انہوں نے سختی سے ڈانٹ پلائی کہ یہ مبتدعانہ بلکہ فاسقانہ عمل ہے! (واضح

رہے کہ یہ سعودی عرب کے "خاتم المفتیین" تھے' اس لئے کہ ان کی وفات کے بعد یہ عہدہ ہی ختم کر دیا گیا۔ اور اس طرح آلِ سعود اور آلِ شیخ کے مابین دنیوی حکومت اور مذہبی سربراہی کی جو تقسیم چلی آ رہی تھی وہ ختم ہو گئی)

۲۔ اس اجلاس کے باضابطہ "کنوینر" تو مولانا علی میاں مدظلہٗ تھے' لیکن عملاً اسے Conduct ڈاکٹر سعید رمضان صاحب کر رہے تھے۔ اس پر ایک صاحب نے اعتراض کیا کہ استاذ سعید رمضان یہاں کس حیثیت میں ہیں؟ تو ڈاکٹر صاحب کا رنگ تو زرد پڑ گیا لیکن مولانا علی میاں نے یہ کہہ کر صورت حال کو خراب ہونے سے بچا لیا کہ "یہ ذمہ داری میں نے ان کے سپرد کی ہے!" (واضح رہے کہ "رابطۂ عالم اسلامی" کی بنیاد اصلاً مصر کے صدر ناصر کے "بُغض" پر رکھی گئی تھی' اور اعتراض کرنے والے غالباً مصری مندوب تھے!)

۳۔ مختلف ممالک سے آئے ہوئے مندوبین اپنے ذاتی تعارف کے ساتھ ساتھ کچھ جذبات و احساسات کا اظہار بھی کر رہے تھے۔ اِس ضمن میں شام کے مندوب کا یہ جملہ بہت دلچسپ تھا کہ :"جب مجھے دعوت نامہ ملا تو میں اس شش و پنج میں مبتلا ہو گیا کہ آؤں یا نہ آؤں۔ اس لئے کہ اس قسم کے اجلاس منعقد ہوتے رہتے ہیں اور ان سے حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔ لیکن بالآخر میں اس نتیجے پر پہنچا کہ جانا نہ جانا برابر ہے۔ لہٰذا میں حاضر ہو گیا!" (اُن کا اشارہ اِس طرف تھا کہ کسی اور خیر کی توقع تو اس اجلاس سے نہیں ہے' تاہم مفت کا سرکاری حج جو اس اجلاس کے "بونس" کے طور مل گیا غنیمت ہے۔ گویا "گندم اگر بہم نہ شود بُھس غنیمت است!")

۴۔ اس موقع پر ایک اجتماع "قصر الملک" میں بھی ہوا جس سے اُس وقت کے بادشاہ اور سعودی مملکت کے بانی ملک عبدالعزیز ابن سعود کے فرزندِ اکبر سعود بن عبدالعزیز نے خطاب کیا۔ جس میں انہوں نے صدر ناصر کا نام لئے بغیر اہلِ مصر کو خوب کوسا۔ ان کے خطاب کا یہ ایک جملہ مجھے ابتک یاد ہے "هُم اَعداءُ اللّٰهِ وَاَعداءُ الرَّسُولِ وَاَعداءُ الدّین و نحن فداءُ الاِسلام بأروَاحنا و اَجسَادِنا!" یعنی وہ تو

اللہ، رسولؐ اور دین کے دشمن ہیں جبکہ ہم دل وجان سے اسلام کے فدائی ہیں!"
—— نفسِ مضمون سے قطع نظر ان کا یہ خطاب بڑا فصیح و بلیغ، شاہی دبدبہ وجلال کا مظہر، اور عربی مقولے "کلامُ الملوکِ ملوکُ الکلام" کا بہترین نمونہ تھا! —— خطاب کے اختتام پر بادشاہ سلامت کھڑے ہوگئے اور جملہ مندوبین ایک قطار کی صورت میں حرکت کرتے ہوئے ان کے سامنے آکر ان سے ہاتھ ملاتے رہے ۔ اتفاقاً مولانا داؤد غزنوی اور میں ذرا آگے تھے لہٰذا ہمیں تو ملک سعود سے مصافحہ کا "شرف" حاصل ہوگیا۔ لیکن میں نے دیکھا کہ مولانا مودودی اور جناب خلیل حامدی ابھی کسی قدر فاصلے ہی پر تھے کہ بادشاہ سلامت غالباً تھک گئے ۔ چنانچہ انہوں نے ہاتھ بلند کردیا —— جس سے یہ سلسلہ فوراً بند ہوگیا۔

مولانا سے میری ایک انتہائی یادگار ملاقات ۸ رذی الحجہ کی شام کو منیٰ میں ہوئی ۔ مولانا سرکاری مہمان ہونے کے ناتے ایک کشادہ اور عمدہ خیمے میں مقیم تھے جس کے ساتھ کچھ کھلی جگہ بھی تھی اور پھر قناتوں کا گھیرا تھا۔ اور مجھے یاد ہے کہ مولانا خیمے کے باہر ایک چارپائی پر تشریف فرما تھے۔ اور ظاہر ہے کہ احرام میں تھے! (چنانچہ مولانا کی وہ احرام والی تصویر میرے نہاں خانۂ ذہن میں تاحال محفوظ ہے۔) بہرحال اصل قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ مولانا اُس وقت سخت صدمے بلکہ پیچ و تاب کی سی کیفیت میں مبتلا تھے۔ اس کیفیت کے دو اسباب اسی وقت معلوم ہوگئے تھے: ایکؔ یہ کہ پاکستان سے اسی روز اطلاع آئی تھی کہ جو بلدیاتی یا بنیادی جمہوریت کا انتخاب ہوا تھا اس میں جماعت بری طرح ناکام ہوگئی تھی ۔ اور دوسرؔا یہ کہ مولانا نے مدینہ یونیورسٹی کے لئے جو خاکہ بڑی محنت سے تیار کیا تھا اسے نجدی علماء کی شدید مخالفت کے باعث کلّیۃً رد کر دیا گیا تھا۔ پہلی بات کے ضمن میں میرے دل میں یہ فوری خواہش پیدا ہوئی تھی کہ وہی ملتان جیل والا سوال آٹھ سال بعد پھر دوبارہ مولانا سے کروں، لیکن مولانا کی اُس وقت کی کیفیت مجھے اس کے لئے موزوں محسوس نہ ہوئی!

البتہ مدینہ منوّرہ میں مولانا کی خدمت میں متعدد بار کی حاضری کے بعد ایک دن

مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں نے براہ راست سوال کر ہی لیا کہ : "مولانا کیا اب بھی آپ اس بات کے قائل نہیں ہوئے کہ ہماری بعد از تقسیم کی پالیسی غلط تھی!" لیکن اس بار اس کا جو جواب مجھے ملا اس میں کسی قدر تلخی اور درشتی کا عنصر بھی شامل تھا ـــــ یعنی :"یہی سوال میں آپ لوگوں سے کرتا ہوں کہ کیا اب بھی آپ لوگوں پر اپنی غلطی واضح نہیں ہوئی!" ـــــ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ میرے دل میں امید کی جو کرن اس وقت تک روشن رہی تھی کہ جیسے جیسے اس طریق کار کے نتائج سامنے آئیں گے ان شاء اللہ مولانا خود اپنی رائے سے رجوع کرکے انتخابی سیاست سے واپسی کا راستہ اختیار کرلیں گے وہ اس روز بالکل بجھ کر رہ گئی!

۶۲ء سے ۷۰ء تک کے عرصے کے بارے میں جو چند سطریں میری ۸۲ء والی تحریر میں شق نمبر ۴ کے ذیل میں درج ہیں ان پر کسی اضافے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے صاف اعتراف ہے کہ اس عرصے کے دوران میرے اور مولانا کے مابین بُعد وفصل ' اور مغائرت واجنبیت ہی نہیں نفرت اور کدورت کے پردے بھی حائل رہے اور اس کیفیت میں میری ذاتی تلخی کے ساتھ ساتھ مولانا امین احسن اصلاحی کی "سرپرستی" کا عنصر بھی شامل رہا جس نے اس میں اضافی شدّت پیدا کردی!

یہ کیفیت فروری ۷۱ء میں جسطرح دفعۃً اور یکسر تبدیل ہوئی اس کا ذکر بھی متذکرہ بالا تحریر میں شق نمبر ۵ کے ذیل میں اجمالاً لیکن اس سے قبل تفصیلاً موجود ہے۔

میرا یہ ردِ عمل تو مولانا کی اس تقریر پر تھا جو مولانا نے دسمبر ۷۰ء میں اچھرہ کے ایک اجتماع میں الیکشن میں جماعت اسلامی کی ذلت آمیز شکست پر ہونے والے تبصروں کے جواب میں جماعت کے مخصوص مزاج اور بالخصوص اس کے تنظیمی ڈھانچے کے "دفاع" میں کی تھی۔ افسوس کہ یہ حقائق میرے علم میں بہت بعد میں آئے کہ اس موقع پر مولانا اس حتمی نتیجے تک بھی پہنچ گئے تھے کہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے لئے الیکشن کا طریقہ بالکل ناکام ہوچکا ہے اور ہمیں اپنے سابق طریق کار ہی کی طرف رجوع کرلینا چاہئے۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ جماعت

اسلامی کی اُس وقت کی قیادت کی صفِ دوم نے مولانا کی اس رائے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا جس پر مولانا کو صدمہ اور افسوس تو بہت ہوا بلکہ مولانا وصی مظہر ندوی کی روایت کے مطابق غصہ بھی آیا لیکن جماعت کی امارت اور اپنی ضعیف العمری اور خرابیٔ صحت کے پیش نظر یہ سکت اب مولانا میں نہیں رہی تھی کہ دوبارہ خود سٹیئرنگ سنبھال کر تحریک کی گاڑی کی "سوّاقی" کے فرائض سرانجام دیتے! بہرحال مَاشاء اللّٰہ کان ومالم یشألم یکن!"

اس دوران میں "دل را بہ دل رہیست!" کے مصداق ظاہر ہے کہ جس تلخی کا مظاہرہ میری جانب سے آٹھ سال تک مسلسل ہوتا رہا تھا اس کا ردِّ عمل مولانا کی طبیعت میں لازماً پیدا ہوا ہو گا۔ اگرچہ میرے علم میں نہیں ہے کہ مولانا نے کبھی کوئی تلخ بات میرے بارے میں کہی ہو' ــــــ لیکن جب خود میری قلبی کیفیت بدل گئی تو اس کا یہ ردِّ عمل میرے علم میں ۱۹۷۶ء میں آیا کہ جب میں اواخرِ ماہ دسمبر میں مع اہلِ خانہ لگ بھگ دس روز کراچی میں مقیم رہا اور انہی ایام میں ایک روز جناب عبدالرحیم صاحب نے جو اُس زمانے میں کراچی پورٹ ٹرسٹ میں ڈپٹی چیف کیمیکل انجینئر کے عہدے پر فائز تھے ہمیں ایک فیملی پکنک کے سلسلے میں سمندر کی سیر کرائی تو اس موقع پر انہوں نے بتایا کہ "انہی دنوں ایک ضیافتِ طعام میں جہاں مولانا مودودی بھی موجود تھے' اور میں بھی' آپ کا (یعنی راقم الحروف کا) ذکر آنے پر مولانا نے یہ فرمایا کہ: مجھے اس کے بارے میں اس بات کا پورا اطمینان ہے کہ وہ جہاں بھی ہو گا دین کا کام کرتا رہے گا!" اس پر ایک بار تو مولانا سے ملاقات کی خواہش کی چنگاری بہت زور سے بھڑکی' لیکن بعد میں اُن اسباب کے باعث جن کا ذکر ۸۸ء کی تحریر میں موجود ہے' زندہ مودودی سے تو ملاقات کی نوبت نہ آ سکی' یہ بھی اللہ کا خصوصی فضل و احسان ہی تھا کہ ان کے جسدِ خاکی کی زیارت اور نمازِ جنازہ میں شرکت ہی نہیں اس کی امامت کی سعادت بھی حاصل ہو گئی! جس کی تفصیلات میری ۸۲ء کی تحریر میں موجود ہیں!

بہر حال جماعت اسلامی کے داعی' مؤسّس اور "فطری امیر" مولانا مودودی کو تو" تِلۡکَ اُمَّۃٌ قَدۡ خَلَتۡ" کے زمرے میں شامل ہوئے تیرہ برس بیت چکے ہیں ۔ اور جس طرح دار العلوم دیو بند اپنا "جشنِ صد سالہ" دھوم دھام کے ساتھ منانے کے فوراً بعد شکست و ریخت سے دوچار ہوگیا تھا' اسی طرح جماعت اسلامی بھی گذشتہ سال اپنا "پچاس سالہ جشن" شان و شوکت کے ساتھ منانے کے بعد داخلی انتشار اور خلفشار کے شدید بحران سے دو چار ہو چکی ہے اور اس فیصلہ کُن دوراہے پر آکھڑی ہوئی ہے کہ ـــــ یا اپنی اِس اصل غلطی کا ادراک اور اعتراف کرے جو ۴۸-۱۹۴۷ء میں پوری نیک نیتی کے ساتھ لیکن "عجلت پسندی" کے باعث ہوگئی تھی' اور اپنے اصل "اصولی" اور "انقلابی" طریق کار کی جانب مراجعت اختیار کرے یا میاں طفیل محمد اور جناب نعیم صدیقی ایسے "اگلے وقتوں" کے لوگوں کے احتجاج اور نالہ و فریاد کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنی بچی کھچی اصول پسندی' سنجیدگی' متانت' شرافت اور قانون و دستور کی پابندی کے "دقیانوسی" لبادے کو بالکل اتار پھینکے اور انتخابی سیاست کا راستہ ہی اختیار کرنا ہے تو جملہ "سِکّہ ہائے رائج الوقت" کا بھرپور استعمال کرتے ہوئے ـ" نصف بہتر حیات کر گذر جو آئے بن!" کا راستہ اختیار کرلے۔

اس ضمن میں ملک بھر کے صحافی اور تجزیہ نگار تو یہی کہہ رہے ہیں کہ پلڑا دوسرا ہی بھاری ہے اور نتیجہ مؤخر الذکر ہی برآمد ہوگا ـــــ لیکن اگر واقعتاً ایسا ہوگیا تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جماعت اسلامی کی "پہلوٹھی کی بیٹی" (یعنی اس کی اولین ذیلی تنظیم) اسلامی جمعیت طلبہ کے "قبضہ گروپ" نے جو جدید قیادت جماعت کو مہیّا کی تھی وہ اپنی کوکھ سے ایک بالکل مختلف ہی نہیں متضاد مزاج اور طرز کی تنظیم یعنی "پاسبان" کو جنم دے کر اپنی "مادر تنظیم" یعنی "جماعت اسلامی" کے اس تنظیمی ڈھانچے کا گلا گھونٹ دے گی جس کا "دفاع" جماعت کے داعی و بانی' اور قائد و امیر مولانا مودودی مرحوم نے ۱۹۷۰ء تک تو پورے عزم بالجزم کے ساتھ کیا تھا ـــــ

اس کے بعد یہ "پاسبان تنظیم" کیا رخ اختیار کرے اور ملک و ملت کو کیا نفع یا نقصان پہنچائے' اور خود کس انجام سے دوچار ہو یہ علیحدہ معاملہ ہے —— اس لئے کہ حالات کے تیور یہی بتا رہے ہیں کہ جماعت کی موجودہ نوجوان قیادت بھی انتخابی سیاست کے نتائج سے تو مایوس اور بددل ہو چکی ہے' لہٰذا یہ نوزائیدہ تنظیم لامحالہ کسی "تصادم" کی راہ اختیار کرے گی۔ اور غیر تربیت یافتہ نوجوانوں کے اس راہ پر پڑنے سے خیر اور صلاح کی امید کم اور شر اور فساد کا اندیشہ زیادہ ہے۔ واللہ اعلم!

لیکن اصل فیصلہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور اسی تعالیٰ کی قدرت و قوت فیصلہ کُن ہے' لہٰذا کیا عجب کہ "لَعَلَّ اللّٰہَ یُحۡدِثُ بَعۡدَ ذٰلِکَ اَمۡرًا" اور "لَعَلَّهُمۡ یَرۡجِعُوۡنَ" کی قرآنی نصوص کے مطابق اس اصل تحریک اسلامی کے بچے کُھچے "باقیات الصالحات" جو ۴۱-۱۹۴۰ء میں شروع ہوئی تھی اسے اس آخری اور فیصلہ کُن تباہی سے بچانے کے لئے کمر کس لیں اور ع "درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا!" کے مصداق ان کی مساعی بار آور ہو ہی جائیں۔

لیکن اس سلسلے میں اصل ذمہ داری پرانے اور بزرگ حضرات کی ہے کہ وہ سنجیدگی کے ساتھ اس پر غور کریں کہ آج وہ جن چیزوں سے سخت توحّش اور بیزاری محسوس کر رہے ہیں وہ اس بنیادی غلطی کے لازمی اور منطقی نتائج اور عواقب کی حیثیت رکھتی ہیں جو ۴۸-۱۹۴۷ء میں سرزد ہوئی تھی اور اس کے برملا اعتراف کے بغیر صورت حال میں کسی بہتری کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اور یہ وہ "سجدۂ سہو" ہے جو۔

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

کے مصداق اس تحریک کو ان تمام خرابیوں کی دلدل سے نکال سکتا ہے جس میں احیاءِ اسلام اور اقامتِ دین کی یہ عظیم تحریک پھنس گئی ہے۔ وما علینا الّا البلاغ!

مطالعہ قرآن حکیم کا منتخب نصاب ـــــ حصہ ششم

اُمتِ مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں
قرآن حکیم کی جامع ترین سورت

یعنی

اُمُّ المُسَبِّحات

سورۃ الحدید

کی مختصر تشریح

از

ڈاکٹر اسرار احمد

❁ دیدہ زیب پرنٹنگ ❁ خوبصورت ٹائٹل ❁ صفحات:368
❁ اشاعت عام:100 روپے ❁ اشاعت خاص:200 روپے

مکتبہ خُدّام القرآن لاهور

36۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور، فون03-5869501

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ——— اور ——— **سرچشمۂ یقین**

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ——— اور ——— اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ **غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی**

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ